

فلسفہ تنقید

”وہ اپنے اصولوں میں جنون کی حد تک انتہا پسند ہے۔“
”وہ خیال پرست ہے اور جو کچھ لکھتا ہے، مروجہ اخلاق میں فساد پیدا کرانے کے لئے لکھتا ہے۔“

”اگر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد و عورت۔ شادی کے مسئلے میں جبران کی رائے چلیں گے معاشرتی زندگی کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ انسانی سماج کی بنیادیں منہدم ہو جائیں گی اور یہ دنیا ایک جہنم اور اس میں رہنے والے شیطان بن کر رہ جائیں گے۔“

”اس کے حسن نگارش کے فریب سے بچو! کہ وہ انسانیت کا دشمن ہے۔“
وہ انارکسٹ ہے! کافر ہے!! ملحد ہے!!! اور ہم مقدس کوہ لبنان کے باشندوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اس کے عقائد پر لات مار دیں۔ اس کی تصنیفات کو آگ میں جھونک دیں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے ملحدانہ نظریوں کا کوئی اثر، دل پر باقی رہ جائے!“

”ہم نے اس کا ناول ”ٹوٹے ہوئے پر“ پڑھا اور اسے زہر آب پایا۔“



یہ ہیں ان خیالات کے چند نمونے جو لوگوں نے میرے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں جنون کی حد تک انتہا پسند ہو، تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کی طرف مائل ہو، میرا دل ان چیزوں سے متنفر ہے جن کا دنیا احترام کرتی ہے اور ان چیزوں سے محبت کرتا ہے جنہیں دنیا ٹھکراتی ہے اور اگر انسان کے عقائد، رسم و رواج اور عادات و خصائل کا استحصال میرے امکان میں ہوتا، تو میں ایک لمحہ کے لئے توقف نہ کرتا، لیکن بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ میری تصنیفات ”زہر بیلا پانی“ ہیں ایک ایسی بات ہے جو حقیقت کو ظاہر تو کرتی ہے لیکن دبیز پردے کے پیچھے سے... اور حقیقت عریاں، یہ

ہے، کہ میں زہر کو پانی میں ملا کر نہیں، کھلا پیا لوں میں انڈیلنا ہوں، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ جن پیالوں میں انڈیلنا ہوں، وہ حد درجہ ساف و شفاف ہوتے ہیں۔

رہے وہ حضرات جو اپنے دلوں میں میری طرف سے یہ عذر پیش کرتے ہیں ”وہ خیال پرست ہے اور بادلوں کی دنیا میں اڑتا رہتا ہے۔“ سو یہ وہ لوگ ہیں جو انڈیلنا شفاف پیالوں کی چمک پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتے ہیں اور اس شراب سے جو ان پیالوں میں ہوتی ہے اور جسے ”زہر“ کہتے ہیں قطع نظر کر لیتے ہیں۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ ان کے کمزور معدے اسے ہضم نہیں کر سکتے۔

یہ تمہید ایک اکھڑا قسم کی گستاخی پر دلالت کرتی ہے لیکن گستاخی کا اکھڑا پن، مگر و فریب ملائمت سے بہتر نہیں ہے؟ گستاخی خود کو اپنے اصلی روپ میں ظاہر کرتی ہے لیکن فریب مانگے کا لباس پہن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔



اہل مشرق چاہتے ہیں کہ ادیب اس شہد مکھی کی مثال ہو جائے جو چھتہ بنانے کے لئے باغوں میں پھولوں کی شیرینی جمع کرتی پھرتی ہے۔

اہل مشرق چاہتے ہیں کہ شاعران کے بادشاہوں، حاکموں اور پادریوں کے سامنے اپنی روح کو عود دلو بان کی طرح سلگائیں اور ہر چند کے مشرق کی فضا درباروں، قمر بان گاہوں اور مقبروں میں سلگائت ہوئے عود دلو بان کے دھوئیں سے اٹ گئی ہے لیکن وہ اب بھی مطمئن نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں منہنی جیسے قصیدہ نگار.... لوقیں جیسے مرثیہ گوئی الدین حلی سے زیادہ جھیلے بھانڈ پائے جاتے ہیں۔

اہل مشرق چاہتے ہیں کہ منکران کے سامنے بید با ابن رشد افرام سریانی اور یوحنا دمشق کے اقوال دہراتا رہے اور اپنی تحریروں میں احقانہ پنہ و نصیحت لامعنی ارشاد و ہدایت اور ان آیات و حکم کی حرود سے تجاوز نہ کرے جن پر عمل کرنے سے انسان کی

زندگی اس حقیر گھاس پھوس کی مثال ہو جاتی ہے جو سائے میں اگے اور اس کا نفس اس کنکنے پانی سے مشابہ ہو جاتا ہے جس میں تھوڑی سی فیون ملی ہو۔

مختصر یہ کہ اہل مشرق ماضی کی نزہت گاہوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ جھوٹی تسلیاں دینے اور مضحکہ خیز سلبی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر ان مجر و تعلیمات اور ایجابی اصولوں سے بھاگتے ہیں جو ڈنک مارتے ہیں اور انہیں پرسکون خوابوں کی گہری نیند سے بیدار کرتے ہیں۔



مشرق بیمار ہے اسے مستقل بیماریوں اور مسل دباؤں نے اس قدر گھیر رکھا ہے کہ وہ بیماری کا عادی اور تکلیف سے مانوس ہو کر اپنے درد الم کو طبعی صفات بلکہ ایک حسین و خوشگوار مزاج سمجھنے لگا ہے جو صحت مند جسم اور پر عظمت روح کے لئے مخصوص ہے اس کے نزدیک اگر کوئی ان بیماریوں اور تکلیفوں سے محفوظ ہے تو ناقص اور قدرت کے عطیوں اور کمالات عالیہ سے محروم!

مشرق کے بہت سے طبیب ہیں جو اس کی نبض دیکھتے ہیں اس کی بیماری کے متعلق باہمی طور پر مشورے کرتے ہیں لیکن جب علاج کی نوبت آتی ہے تو وہی ہنگامی نشہ آور دوائیں دیتے ہیں جو مرض کی مدت تو بڑھا دیتی ہیں، لیکن اسے زائل نہیں کرتیں۔

ان معنوی مخدرات کی بہت سی قسمیں ہیں، بہت سی شکلیں اور بہت سے رنگ ہیں اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح ایک بیماری سے دوسری بیماری اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ مشرق میں جب کبھی کوئی نیا مرض نمودار ہوتا ہے اس کے لئے مشرقی اطباء نیا مخدر ایجاد کر لیتے ہیں۔

لیکن وہ اسباب جن کے نتیجے میں یہ مخدرات ایجاد کئے جاتے ہیں، حد شمار سے

باہر ہیں جن میں سب سے اہم سبب بیمار کا قضاء و قدر کے مشہور فلسفہ پر ایمان لانا، اور بیویوں کے بز دلی اور اس الم کے ہیجان سے خوف کھانا، جسے سرسبز و شاداب وادیاں پیدا کرتی ہیں۔

اب میں ان مسکنات و مخدرات کی مختلف مثالیں پیش کرتا ہوں، جو اطباء مشرق نے وطنی، مذہبی اور معاشرتی بیماریوں کے لئے ایجاد فرماتے ہیں۔

شوہر کے دل میں بیوی کی طرف سے اور بیوی کے دل میں شوہر کی طرف سے بعض زندہ اور طری اسباب کی بنا پر نفرت بیٹھ جاتی ہے اور وہ دونوں لڑ بھڑ کے، ما پیٹ کر کے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں لیکن چوبیس گھنٹے گزرنے نہیں پاتے کہ مرد کے رشتہ دار اس کی بیوی کے رشتہ داروں کے پاس جاتے ہیں، جھوٹی دیر تک حسین و شستہ الفاظ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کے بعد سب اس امر پر متفق ہو جاتے ہیں کہ میاں بیوی میں صلح کرادی جائے، چنانچہ یہ قافلہ عورت کے پاس آتا ہے اور ان جھوٹی سچی نصیحتوں سے اس کے جذبات کو لبھاتا ہے جو اسے شرمندہ تو کر دیتی ہیں، لیکن مطمئن نہیں کر سکتیں، اس کے بعد مرد کو بلایا جاتا ہے اور اس پر ان اچھی اچھی باتوں اور عمدہ عمدہ مثالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی جاتی ہے جو اس کے خیالات میں نرمی تو پیدا کر دیتی ہیں لیکن انہیں بدل نہیں سکتیں اور اس طرح ان میاں بیوی مین جو روحانی طور پر ایک دوسرے سے متنفر ہیں، صلح..... ہنگامی صلح.... کا مقدس فرض انجام دے دیا جاتا ہے۔ اب وہ میاں بیوی، اپنے ارادہ کے خلاف پھر ایک جگہ رہنا شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کے ملع اتر جاتا ہے اور اس مخدر کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے جو عزیزوں اور رشتہ داروں نے استعمال کرایا تھا، چنانچہ مرد پھر اپنی نفرت و کراہت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور عورت پھر اپنی بد قسمتی کا پردہ چاک کر دینا چاہتی ہے لیکن وہی لوگ جنہوں نے پہلے صلح کرائی تھی، دوبارہ یہ اہم فرض انجام دیتے ہیں، رہے شوہر اور بیوی، سو جو کوئی مخدرات کا ایک قطرہ پی لے وہ بھرے ہوئے

جام پینے سے بھی انکار نہیں کرتا۔

قوم جا بر حکومت یا قدیم نظام کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور ”جمہیتہ اصلاحیہ“ کی بنیاد رکھ کر ترقی اور آزادی کی طرف قدم بڑھاتی ہے گرم گرم تقریریں کی جاتی ہے، بے دھڑک مضامین لکھے جاتے ہیں۔“

”میزانیہ“ اور ”لائحہ عمل“ شائع ہوتے ہیں، وفد اور نمائندے بھیجے جاتے ہیں، لیکن ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مہینے نہیں گزرنے پاتے جو ہم سنتے ہیں کہ حکومت نے جماعت کے لیڈر کو گرفتار کر لیا، یا اس کا وظیفہ مقرر کر دیا، اس کے بعد ”جمہیتہ اصلاحیہ“ کے متعلق کچھ سننے میں نہیں آتا اس لئے کہ اس کے ارکان مخدرات کے چند قطرے پی کر، پھر سکون و اطاعت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

جماعت، بنیادی امور کے پیش نظر، اپنے مذہبی پیشوا کے خلاف آواز اٹھاتی ہے، اس کی شخصیت کو اپنی تنقید کا ہدف بناتی ہے اس کے افعال پر نکتہ چینی کرتی ہے، اس کی روش کو ٹھکراتی ہے اور اسے ایک نیا مذہب اختیار کر لینے کے ڈراوے دیتی ہے، جو عقل سے قریب اور اوہام و عرفات سے دور ہوگا، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا، جو سننے میں آتا ہے کہ ملک کے تظلمندوں نے مذہبی پیشوا اور اس کے پیروں کی مخالفت ختم کر دی ہے اور طلسمی مخدرات کے فیض اثر سے مرشد کی شخصیت میں وہی ہیبت و جلال اور حلقہ بگوشوں کے دل میں وہی اندھی اطاعت پھر پیدا ہو گئی ہے۔

کمزور مظلوم، طاقت و نظام کے ظلم کی شکایت کرتا ہے تو ہم مسایہ کہتا ہے۔

”خاموش! وہ آنکھ، جو تیر کا مقابلہ کرتی ہے، پھوڑ دی جاتی ہے۔“

دیہاتی راہبوں کے اخلاص اور پرہیزگاری کے متعلق شبہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کا ساتھ کہتا ہے۔

”جب! کتاب میں آیا ہے کہ ان کی بات سنو، لیکن ان کے افعال کی تقلید نہ کرو!“

شاگرد۔ بصرہ اور کوفہ کے علما نے جو کی بحثوں کو یاد کرنے سے گریز کرتا ہے تو استاد کہتا

ہے۔ کامل اور ست لوگوں نے اپنے لئے ایسے عزت تلاش کر لئے ہیں جو گنا سے زیادہ قابل نفرت ہیں۔“

نوجوان لڑکی بیواؤں کی سی زندگی بسر کرنے سے بچتی ہے تو اس کی ماں کہتی ہے۔
”لڑکی اپنی ماں سے افضل نہیں ہوتی، اس لئے جو راستہ تیری ماں نے اختیار کیا تھا تو بھی وہی اختیار کر!!“

نوجوان لڑکی کا فضول مذہبی رسموں کے متعلق سوال کرتا ہے تو پادری جواب دیتا ہے۔

”جو کوئی ایمان کی آنکھ سے نہیں دیکھتا اسے اس دنیا میں کھرا اور دھوئیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“

ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا، لیکن مشرق کا انسان اپنے نرم و گداز بستر میں پڑا سو رہا ہے۔ جب کبھی مجھ پر کاٹتے ہیں تو ایک لمحہ کے لئے بیدار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد پھر ان مخدرات کے زیر اثر جو اس کے جسم کی ہر رگ اور خون کے ہر قطرہ میں کار فرما ہیں، سو جاتا ہے۔

جب کوئی شخص کھڑے ہو کر سونے والوں کو پکارتا ہے اور ان کے گھروں عبادت گاہوں اور عدالتوں کو اپنی بلند آوازوں سے لبریز کر دیتا ہے تو وہ اپنی ابدی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولتے ہیں اور جمائیاں لے لے کر کہتے ہیں۔

”کس قدر بد تمیز ہے یہ نوجوان کہ نہ خود سوتا ہے، نہ دوسروں کو سونے دیتا ہے۔“
اس کے بعد پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنی روح سے با انداز سرگوشی کہتے ہیں۔

”وہ کافر ہے! ملحد ہے!! مروجہ اخلاق میں فساد پیدا کرتا ہے، قوموں کی بنیادوں کو ڈھاتا ہے اور انسانیت کا سینہ اپنے نوکیلے تیروں سے چھلانی کرتا ہے۔“



جب میں ان بیدار اور سرکش لوگوں میں تھا، جو مخدرات اور مسکنات کے استعمال سے انکار کرتے ہیں تو اکثر اپنے نفس سے سوالات کرتا تھا اور میرا نفس مبہم اور مشتبہ الفاظ میں جواب دیتا تھا جب لیکن میں نے سنا کہ لوگ میرے نام پر لعنت بھیجتے ہیں اور میرے اصولوں پر تھوٹھو کرتے ہیں تو مجھے اپنی بیداری کی حقیقت کا یقین ہو گیا۔ اور میں نے جان لیا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خوشگوار خوابوں اور دکش خیالوں کے طندے ہیں بلکہ ان وحدت پسندوں میں سے ہوں جو زندگی کو اننگ راہوں کے ذریعہ طے کرتے ہیں جن پر پھول اور کانٹے چھپے ہیں اور جن کے چاروں طرف شکاری بھیڑیے اور چچاتی ہوئی بلبلیں ہیں۔

اگر بیداری کوئی فضیلت ہوتی تو میری حیا مجھے اس کے دعوے سے ضرور باز رکھتی، لیکن وہ کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے، جو وحدت پسند افراد پر غفلت دے بے خبری کے عالم میں منکشف ہو کر ان کے آگے آگے چلتی ہے اور وہ اس کے مخفی تاروں میں بندھے اور ہولناک مقاصد پر نگاہیں جمائے اس کے ساتھ ساتھ ہو لیتے ہیں۔“



کل جب ہمارے ”ادبا اور مفکرین“ میرے ان خیالات کو پڑھیں گے تو نفرت و بیزاری کہ لہجہ میں کہیں گے۔

”وہ انتہا پسند ہے جو زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھتا ہے اور تاریکی کے سوا، اسے اور کچھ نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ وہ مسلسل ہم پر رو رہا ہے اور لگاتار ہماری حالت پر ماتم کر رہا ہے۔“

میں ان ادبا اور مفکرین کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

”میں مشرق پر ماتم کرتا ہوں اس لئے کہ مردہ لاش کے سامنے رقص کرنا انتہائی

درجہ کا پاگل پن ہے۔“

میں اہل مشرق پر روتا ہوں اس لئے کہ بیماریوں پر ہنسنا جہل مرکب ہے!
میں اس پیارے ملک کا مرثیہ پڑھتا ہوں، اس لئے کہ اندھی مصیبت کے سامنے
گانا اندھی جہالت ہے۔

میں انتہا پسند ہوں اس لئے کہ جو کوئی حقیقت کے اظہار میں اعتدال سے کام لیتا
ہے اس کے نصف حصہ کو بیان کرتا ہے اور نصف آخر کہنے والے کے اس خوف میں
چپا رہ جاتا ہے جو اسے لوگوں کی بدگمانیوں اور خیال آرائیوں سے ہوتا ہے۔

میں سڑی ہوئی لاش دیکھتا ہوں تو میرا دل اس قدر نفرت کھاتا ہے اور میری روح
اس درجہ مضطرب ہو جاتی ہے کہ میں اس کے پاس نہیں بیٹھ سکتا، خواہ میرے دائیں
ہاتھ پر شراب کا پیالہ ہو بائیں ہاتھ پر شیرینی کی ٹشتری!

اس بنا پر اگر کوئی میرے نوحوں کو قہقہوں سے، میری نفرت کو محبت سے اور میری
انتہا پسندی کو اعتدال سے بدلنا چاہتا ہے تو مجھے اہل مشرق میں کوئی ایسا حاکم عادل
دکھائے جو مذہب کا پابند ہو اور صحیح راہ پر چلتا ہو، مجھے کسی ایسے مذہبی پیشوا کا پتہ دے
جس کے علم و عمل میں مطابقت ہو اور مجھے کوئی ایسا شوہر بتائے جو اپنی بیوی کو بھی اسی
آنکھ سے دیکھتا ہو جس آنکھ سے وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔

اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ مجھے رقصاں دیکھے یا ڈھول اور بانسری بجاتے سنے تو اسے
چاہئے کہ مجھے شادی کی محفل میں بلائے نہ یہ کہ قبرستان میں لے جا کے کھڑا کر
دے۔



فلسفہ جدائی

اپریل کی حسین اور چمکیلی صبح ہے۔ آفتابی کرنیں نوشگفتہ غنچوں کے ساتھ کھیل رہی ہیں اور ساکنانِ چمن نسیمِ سحر کے عطربیز جھونکوں سے منور ہیں۔

ہر چہار طرف طمانیت کا دور دورہ ہے اور حیاتِ نو کی حلاوت۔

لیکن میں آہ! میری زندگی تو اب بھی ایک بے رونق صبح کی طرح ہے۔ خاموش اور افسردہ، جیسے حد سے بڑھ کر کھلے ہوئے پھول کی پتھڑیاں بکھر جاتی ہیں۔

تمہارے بعد! مجھے حسنِ چمن پھیکا نظر آتا ہے اور صبح کا پیارا پیارا چہرہ مرجھایا ہوا۔ کاینات پر شام کی سرخی چھا گئی۔ آفتاب کھجور کے درخت کے پیچھے غروب ہو رہا ہے اور فضا پر غلبہ کیف و سرور ہے۔

ہر شے پر لرزشِ حیات طاری ہے جیسے ہوا کے جھونکوں سے اشجار کی نرم شاخیں جھوما کرتی ہیں۔

لیکن میرے لئے تو یہ شام بھی۔ خزاں کی افسردہ سہ پہر ایسے کم نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذرہ ذرہ غرقِ محسن ہے اور دنیا ئے چمن بے رونق.... غنچے سسک رہے ہیں اور پتے ٹھونغاں۔

تمہارے بعد مجھے ہر لذت ہم آغوش درد معلوم ہوتی ہے اور نالہ احساس سے پاش پاش۔ نیلگوں آسمان پر شاخ ستارے چمک رہے ہیں۔ چاند سمندری لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ اس کی چاندنی سکون آمیز ہے اور روح پرور.... پر نہ معلوم کیوں؟ مجھے محفلِ انجم مدہم نظر آتی ہے اور چاند کا حسین چہرہ زرد زردات خاموشیوں کی ہستی ہے اور اداسیوں کا مسکن۔

تمہارے بعد تو میرا جذبہ احساس ہی کچل کر رہ گیا۔ اب ایک بیکار وجود ہے اور دیوانے کے خواب کی طرح پریشان روح۔



فلسفہ جستجو

شب کے سنائے میں جب دیوار پر سائے متحرک ہو جاتے ہیں جیسے جناب ہیو لائی چل پھر رہے ہوں اور شیشم کے درخت ہم آواز ہو کر چنچنا شروع کر دیتے ہیں۔
زرد چاند اک کفن میں لپیٹی ہوئی نعش کی طرح نظر آتا ہے اور ستارے پردہ سحاب ہٹا کر مغموم انداز سے جھانکتے ہیں۔

تو میری روح عالم خیال کے راستوں پر پرواز کرنے کو یقینار ہو جاتی ہے اور غیر مرنی وادیوں میں تمہیں تلاش کرتی پھرتی ہے۔
پر آہ! تم اسے وہاں نظر نہیں آتیں نہ ہی کوئی نشان خاک پالماتا ہے جس سے تمہارے قیام کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

آہ! میری روح!! ملول و ناکام!!! بھٹکی ہوئی واپس آ جاتی ہے۔
پھر! جب خواب کی حسین ملکہ مجھے اپنے لبادے میں چھپا لیتی ہے تاکہ کشاکش حیات کو کچھ دیر کے لئے بھول جاؤں اور اس کی تلخیوں کو فراموش کر سکوں۔
لیکن آہ! میری شوریدہ بختی!! کہ مایوس تمنا روح کو تو اب بھی قرار نہیں۔ وہ تمہاری جستجو میں فوں میں چکر کاٹتی ہے۔ اس غریب الوطن پرند کی طرح! جس کا کہیں مسکن ہونہ ٹھکانا۔

وہ ایک ایک کنج میں دڈھونڈھتی پھرتی ہے۔ پر آہ! تم تو کہیں بھی نظر نہیں آتیں اور نہ ہی تمہاری کوئی یادگار! اپنی حرماں نصیبی پر وہ اسی طرح بے چین ہو جاتی ہے جیسے ساز کے پرسکوت تاروں میں مثلاً طم نغمہ!

اور پھر! میری مایوس و افسردہ روح!! وہ نام کام واپس آ جاتی ہے۔
محفل تمہاری شیریں یاد کا سہارا لئے اور بازیافت کے بھروسے پر۔



فلسفہ مسرت

کہا جاتا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے خوشی اک امر لازم ہے۔ ایسی خوشی! جو رنج کی گھڑی بھی اپنے تصور میں ہی گزار دے۔

کہتے ہیں کہ قدرت ہر وقت متنہم رہتی ہے اور مسرور مجسم ہو افرط مسرت سیٹھکیلیاں کرتی چلتی ہے۔ پتے شوخی سے تالیاں بجاتے ہیں۔ چاند ہنستا ہوا نکلتا ہے اور اپنی سہانی سہانی چاندی میں سب کو لپیٹ لیتا اور پہاڑ بادلوں سے دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔

لیکن کون کہتا ہے کہ قدرت رنج و الم سے بے نیاز ہے ورنہ بادلوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو کیوں گرتے ہیں؟ ہوا کے جھونکوں پر غم کا عنصر کس لئے چھا جاتا ہے۔ پتے ساکت ہو جاتے ہیں۔ چاند کی زردی بڑھتی جاتی ہے اور حسین چاندنی اداس! اداس!!

یہ صحیح ہے کہ سمندر کی اٹھڑ موجیں پوری طاقت سے بڑھتی ہیں۔ تھپتھپ لگاتی بڑھتی جاتی ہے۔ ساحل کو گیت سناتی ہیں اور چٹانوں سے کھیلتی ہیں.... اور وقت معینہ پر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ مسرور شاد شاد!!

لیکن اس حقیقت کو کیوں کر جھٹلایا جاسکتا ہے کہ یہی موجیں حالت رنج و الم میں طوفان پیا کر دیتی ہیں۔ جھاگ بہا بہا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ اور آخر کار تہہ وبالا ہو جاتی ہیں۔

اکثر یہ کہہ کر تسلی دی جاتی ہے کہ اگر موسم سرما آسکتا ہے تو بہار کیا کہیں دور رہ گئی؟... لیکن اس پر بھی کبھی غور کیا جاتا ہے کہ بہار کے بعد خزاں کس انداز سے آتی ہے.... افسردہ سا ماحول لے کر اور بلائے جان بن کر.... پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور پر نے آشیانوں میں نہیں۔

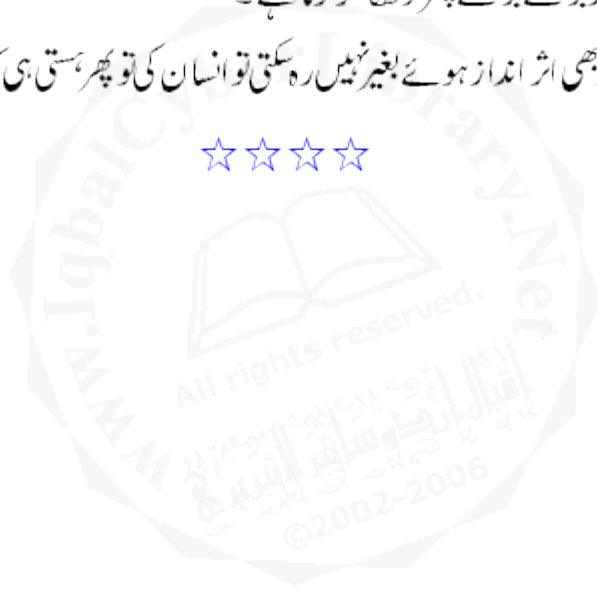
تروتازگی کی بجائے بے سرو سامانی چھا جاتی ہے اور عیش و مسرت کی جگہ رنج و

کلفت -

آہ! جب ناسازگی روزگار، کوہِ عظیم تک کا قلب چور چور کر دیتی ہے اور وہ اپنے غم و

غصہ اظہار بڑے بڑے پتھر لڑھکا کر کرتا ہے۔

موسم پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تو انسان کی تو پھر ہستی ہی کیا ہے۔



فلسفہ وقت

دہر کی ہنگامہ رانیوں سے بے نیاز چلا جا رہا ہے۔ اپنی دھن میں کھویا کھویا اور اپنی ہی دھم میں مستغرق! امروز میں اس کے لئے کوئی کشش ہے اور نہ فردا میں کسی قسم کی دلچسپی بس ایک ادائے فرض و خیال ہے جو جان ناتواں کے لئے سوہان روح ہے اور ہلجا ماوائے حیات۔

بہار کی پرسرور صبح ہو یا خزاں کے بے کیف دوپہر! بیمار کی کراہ جیسا اداس موسم ہو یا برگ خزاں کی طرح پڑ مرده ماحول۔

یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر چلتا جاتا ہے ہوا کے شریدہ جھونکے کی طرح! ادھر آیا اور ادھر غائب بھی ہو گیا۔

اس کے ننھے سے پشتارے میں شگفتہ تہقے پوشیدہ ہیں اور اضطراب کی بجلیاں نہاں! آس کی اہریں ہیں اور یاس کے چھینٹے! یہ آہوں کا دھواں لئے ہوئے ہے اور مسرتوں کا خزینہ بھی۔

مجھے تو اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قدرت اس کے پہلو میں دل رکھنا بھول گئی ورنہ اس قدر بے حسی! ایسی بے نیازی کہ نہ آنسوؤں کا طوفان اسے مغموم کر سکتا ہے اور نہ مسرتوں کا انبار مسرور۔

اللہ اس گھنٹوں سوچتا ہی رہ جاتا ہوں کہ آخر اس کی اصلی رضا کیا ہے۔

صبح کو آفتاب کے ساتھ ساتھ اس کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں بھی جاری رہتا ہے اور شام کے دھندلکے میں جب سب اپنے اپنے مساکن کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں تب بھی یہ کائنات کی وسعتوں میں پھرتا رہتا ہے۔ رات کے تاریک سایوں میں پرواز کرتے ہوئے پرند کی طرح جس کا نہ کہیں ٹھکانا ہو اور نہ آشیانہ۔

لیکن ان تفاوتوں کے باوجود شاعر نازک خیال اس کا منتظر ہے اور صحت ادب اس

کے مرہون کرم۔

کوئی شاد شاد ہو یا افسردہ و سسکت! یہ ہر ایک کے لئے ماہ شوال بن کر آتا ہے۔
گیت کی طرح سہانا اور قوس و قزح کی سی دل فریبیاں لئے ہوئے۔

اور میرے لئے تو اس کی آواز! اس نقرنی گھنٹی سے کم نہیں جو سحر کے سہانے وقت
میں معبدوں میں بجا کرتی ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ پر روح کے خوابیدہ ساز
بچنے لگتے ہیں اور اس کے لائے ہوئے رنعات حاصل ”نصف ملاقات“ ہیں۔

اللہ! میرے لئے تو وہ دولت کائنات سے بھی قیمتی ہیں اور محنتگی حیات کا بہترین

علاج۔



All rights reserved
©2002-2006

فلسفہ اقوام

قوم ان مختلف الاخلاق، مختلف العقیدہ اور مختلف الرائے افراد کا مجموعہ ہے جنہیں ایک معنوی رشتہ آپس میں ملاتا ہے.... وہ معنوی رشتہ جو اخلاق سے زیادہ قومی، عقیدہ سے زیادہ گہرا اور رائے سے زیادہ اہم ہے۔

کبھی وحدت دینی اس رشتہ کا ایک تار ہوتی ہے لیکن یہ تار اتنا قومی نہیں ہوتا کہ دوسرے قومی رابطوں کی مضمحل کر دے۔ ہاں اگر وہ رابطے ہی بوسیدہ اور کمزور ہوں جیسا کہ بعض مشرقی ممالک میں پایا جاتا ہے تو دوسری بات ہے۔

کبھی وحدت لسانی اس رابطہ کا بنیادی سبب ہوتی ہے لیکن بہت سی قومیں ہیں، جو ایک زبان بولتی ہیں لیکن سیاست، نظام حکومت اور اجتماعی نظریات کے اعتبار سے ان میں مستقل اختلاف ہے۔

کبھی وحدت دنیوی اس رابطہ کا بنیادی سبب ہوتی ہے لیکن تاریخی میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن کے ذریعہ ہم ثابت کر سکتے ہیں مختلف ہم نسل قبیلے ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور یہ علیحدگی، باہمی کدورت، لڑائی جھگڑوں اور نتیجہ میں زوال و فنا کا سبب بن گئی۔

اور کبھی مادی مصلحت تعاون کا باعث ہوتی ہے جس پر یہ رشتہ لپٹا جاتا ہے لیکن بہت سے گروہ ہیں جن کی مادی مصلحت کچھ نہیں ہوتی سوائے نفسانیت اور منافقوں کے۔

اچھا! تو پھر یہ قومی رابطہ کیا ہے؟ اور وہ کونسی زمین ہے جہاں قوموں کے بت بنتے ہیں؟

قومی رابطہ کے سلسلے میں میری ایک رائے ہے جسے بعض مفکرین اس لئے عجیب سمجھتے ہیں کہ اس کے اصول و نتائج امور محسوسہ سے تعلق نہیں رکھتے۔

بہر حال میری رائے یہ ہے کہ۔ ہر قبیلہ کا ایک ”دفس اجتماعی“ ہوتا ہے جو اپنے جو

ہر طبیعت کے اعتبار سے نفس انفرادی سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ نفس اجتماعی اپنے وجود کے لئے قبیلوں کے افراد کا محتاج ہے جس طرح درخت اپنی زندگی کے لئے پانی، مٹی، روشنی اور حرارت کا محتاج ہے تاہم وہ قبیلوں سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے اور اس کی ایک خاص زندگی اور ایک جداگانہ ارادہ ہوتا ہے لیکن جس طرح میرے لئے اس زمانہ کی تجدید و تعیین دشوار ہے جس میں نفس انفرادی پیدا ہوتا ہے اسی طرح میرے لئے اس زمانہ کی تجدید و تعیین بھی مشکل ہے جس میں نفس اجتماعی تشکیل پاتا ہے تاہم یہ میں ضرور جانتا ہوں کہ مثلاً مصری قوم ساحل نیل پر ابتدائی حکومت کی بنیاد رکھے جانے سے کم از کم پانچ سو برس پہلے نمایاں ہوئی اور نفس اجتماعی سے مصر نے اپنے تمام فنی، مذہبی اور اجتماعی مظاہر میں مدد لی۔

جو کچھ میں نے مصر کے متعلق کہا ہے وہی اشور، ایران، روم اور عرب وغیرہ کی جدید قوموں پر بھی صادق آتا ہے.... جدید قوموں سے میری مراد وہ قومیں ہیں جو از منہ وسطیٰ کے بعد وجود میں آئی ہیں۔

میں نے کہا ہے اور صحیح کہا ہے کہ نفس اجتماعی کی ایک خاص زندگی ہوتی ہے اور جس طرح ہر زندہ شے کی ایک محدود عمر ہوتی ہے اسی طرح نفس اجتماعی کے لئے بھی ایک وقت ہوتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتا۔ اور جس طرح وجود شخصی بچپن سے جوانی، جوانی سے کہولت اور کہولت سے بڑھاپے کی منزل میں جاتا ہے اسی طرح نفس اجتماعی کا وجود بھی نیند کی نقاب سے گھبرائی ہوئی صبح کی بیداری سے، سورج کی شعاعوں سے روشن دوپہر کی بیداری سے لباس بیزاری میں ملبوس شام کی بیزاری سے نیند کی گہرائیوں کی طرف جاتا ہے۔

یونانی قوم، ولادت مسیح سے ایک ہزار سال پہلے بیدار اور پانچ سو سال قبل مسیح میں عظمت و جلال سے ہم کنار ہوئی لیکن مسیح کا دور آیا تو بیداری کے خوابوں سے اکتانگی اور ابدی خوابوں سے گلے ملنے کے لئے ابدیت کے بستر میں سو گئی۔

عربی قوم ظہور اسلام سے تین سو سال پہلے وجود میں آئی اور اسی زمانی میں اسے اپنے شخصی وجود کا احساس ہوا یہاں تک کہ جب پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے تو ایک دیو کی طرح کھڑی ہوئی اور آندھی کی طرح ہر اس چیز کو فنا کر دیا جو اس کے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوئی اور جب خاندائے عباسیہ کا دور آیا تو اس ہزار پایہ تخت پر بیٹھ گئی جس کا ایک پایہ ہندوستان میں تھا اور دوسرا اندلس میں۔ لیکن جب اس کی ترقی کا آفتاب غروب ہونے کو آیا اور مغل قوم نمایاں ہو کر مشرق سے مغرب تک پھیل گئی تو عربی قوم اپنی بیداری سے تنگ آ کر سو گئی لیکن اس کی نیند گہری نیند نہیں بلکی اور چلتی ہوئی نیند ہے چنانچہ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ دوبارہ بیدار ہوگی اور ان تمام قوتوں کا مظاہرہ کرے گی جو اس کے نفس میں چھپی رہ گئی ہیں بالکل اسی طرح جیسے رومانوی قوم اطالوی تحریک کیے زمانے میں جو رنسانس کے نام سے مشہور ہے دوبارہ بیدار ہوئی اور وینس فلورنسا اور میلان میں اپنے ان واجبات کی تکمیل کی جن کی ابتداء اس نے تو تو فی قبائل کے حملے سے پہلے کر دی تھی۔

تاریخ میں جتنی قومیں ملتی ہیں ان سب سے زیادہ عجیب و غریب قوم فرانسیسیوں کی ہے جس کو وجود میں آئے دو ہزار برس ہو گئے لیکن وہ ابھی تک جوانی کے دلکش دور میں ہے۔ اس قوم میں آج بھی وہی فکر کی وقعت۔ نظر کی تیزی اور علم ذہن کی وسعت پائی جاتی ہے جو اس کی تاریخ کے ہر دور میں اس کا سرمایہ سمال تھی بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ان خصوصیات میں اس نے نمایاں ترقی کی ہے اور برابر کر رہی ہے۔

فردواں، کاریہ، شنیاں، ہیوگر، ریٹاں، راسد، سیمونی اور ان کے علاوہ انیسویں صدی کے تمام فرانسیسی اہل کمال فن، علم اور خیال کے اعتبار سے دنیا کے ہر بڑے آدمی پر فوقیت رکھتے ہیں۔

ہمیں ایک بات یہاں اور ثابت کرنی ہے کہ بعض قوموں کی عمر بعض قوموں کے

مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتی ہے چنانچہ مصری قوم تین ہزار برس تک زندہ رہی، بر خلاف اس کے یونانی قوم ایک ہزار برس سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی قوموں کی عمر کے کم یا زیادہ ہونے کے اسباب بھی وہی ہیں جو افراد کی عمر کے کم یا زیادہ ہونے کے ہیں۔

لیکن زندگی کے اسٹیج پر اپنا پارٹ ختم کرنے کے بعد، قوم پر کیا گزرتی ہے؟ کیا وہ آنے والی نسلوں کے لئے اپنی یاد کے سوا کچھ اور چھوڑے بغیر مر جاتی ہے کیا وہ زمانہ کے ہاتھوں اس طرح پر مال ہو جاتی ہے گویا کبھی تھی ہی نہیں؟ میرا عقیدہ ہے کہ وجود معنوی متغیر ہو سکتا ہے لیکن فنا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ جو مادی کی طرح ایک سے دوسری شکل اور ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرتا ہے لیکن اس کے فطری ذرات زمانہ کے ساتھ باقی رہتے ہیں۔ اس بناء پر کسی قوم کا نفس اجتماعی سوتا تو ضرور ہے لیکن پھولوں کی طرح زمین میں اپنے بیج ڈال کر، رہی اس کی روح، سو وہ عالم ابد کی طرف بلن ہوتی ہے اور میرے نزدیک قوم ہو یا پھول، اس کی روح.... خوشبو.... ہی تنہا حقیقت.... جو ہر مطلق.... ہے۔ چنانچہ شیب، بابل نینوا اور ایتھنز اور بغداد کی روح کی گہرائیوں میں جا گزریں ہے اور ہم.... انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے.... ہر اس قوم کی میاں ہیں جو سطح زمین پر نمودار ہو چکی ہے لیکن یہ مقدس میراث اس وقت تک منفرد یا مجتمعاً کوئی مخصوص صورت اختیار نہیں کر سکتی جب تک کوئی ایسی قوم وجود میں نہ آئے جو تمام افراد اور ساری جماعتوں کو اپنے اندر جذب کر لے اور اس طرح ایک ہمہ گیر نفس اجتماعی تشکیل پا جائے جس کی خاص زندگی اور جداگانہ ارادہ ہو۔



فلسفہ کلام

میں کلام اور کلام کرنے والوں سے اکتا گیا ہوں۔

میری روح کلام اور کلام کرنے والوں سے تھک گئی ہے۔

میری عقل کلام اور کلام کرنے والوں میں کھو گئی ہے۔

صبح کو جب میں بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ کلام میرے پلنگ کے پاس اخبارات و رسائل پر بیٹھا مجھے مکر و خباثت کی آنکھوں سے گھور رہا ہے۔

میں بستر سے اٹھا اور قہوہ کی ایک پیالی سے نیند کا خمراز ازل کرنے کے لئے کھڑکی کے پاس جا بیٹھا میرے ساتھ کلام بھی اٹھا اور چیخ و پکار مچاتے ہوئے میرے سامنے ناپنے لگا۔ اس کے بعد جب میں نے قہوہ کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میرے ساتھ قہوہ پینے لگا۔ پھر میں نے جب سگریٹ سلگایا تو اس نے بھی سلگایا اور جب میں نے اسے ختم کر کے پھینکا تو اس نے بھی پھینک دیا۔

میں کسی کام کے لئے اٹھتا ہوں تو کلام بھی سائے کی طرح میرے ساتھ لگا رہتا ہے۔ مجھ سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ میرے سر کے گرد منمناتا ہے اور میرے دماغ کی خلاؤں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیتا ہے لیکن جب میں اسے بھگانا چاہتا ہوں تو وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہے اور پھر کانا پھوسی کرنے، منمنانے اور شور مچانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

میں بازار جاتا ہوں تو کلام کو ہر دوکان کے دروازہ پر کھڑا پاتا ہوں ہر مکان کی دیواروں پر چلتے پھرتے دیکھتا ہوں میں اسے لوگوں کے چہرہ پر دیکھتا ہوں حالانکہ وہ خاموش ہوتے ہیں میں اسے ان کی حرکات و سکنات میں پاتا ہوں حالانکہ وہ بے خبر ہوتے ہیں۔

اگر میں اپنے کسی دوست کے پاس بیٹھتا ہوں تو کلام ہم میں تیسرا ہوتا ہے اور

جب کسی دشمن سے دو چار ہوتا ہوں تو اس وقت کلام پھول کر پھیل جاتا ہے اور نکلے نکلے ہو کر لشکر جہاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا ایک سر مشرق میں ہوتا ہے اور دوسرا مغرب میں پھر جب میں اپنے دشمن کو چھوڑ کر بھاگتا ہوں تو اس کے کلام کی صدائے بازگشت میرے دماغ میں ہمنگامہ پیدا کرتی رہتی ہے جس طرح غیر منہضم غذا معدہ میں بے چینی پیدا کرتی ہے۔

میں عدالتوں، کالجوں اور مدرسوں میں جاتا ہوں تو کلام کو اس کے باپ اور بھائیوں کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ وہ سب کے سب جھوٹ کے چادر اوڑھے، فریب کا عمامہ باندھے اور مکاری کے جوتے پہنے ہوتے ہیں۔

پھر میں کارخانوں، مکتبوی اور دفاتروں میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کلام اپنی ماں چچی اور دادی کے پہلو میں بیٹھا اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا ہے اور وہ سب کی سب کلام پر مسکرا رہی ہیں اور مجھ پر ہنس رہی ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر مجھ میں صبر و ارادہ کی قوت باقی رہ جاتی ہے تو میں ہیکوں اور عبادت گاہوں کی زیارت کے لئے جاتا ہوں۔ کلام وہاں بھی مجھے تخت پر بیٹھا نظر آتا ہے اس شانم سے کہ سر پر تاج ہوتا ہے اور ہاتھوں میں نہایت عمدہ اور نیش بہا عصائے شاہی۔

اور جب شام کو اپنے گھر واپس آتا ہوں تو پھر اسی کلام کو پاتا ہوں جسے میں نے صبح کو سانپ کی طرح ریختے اور بچھوؤں کی طرح ڈنک مارتے دیکھا تھا۔

کلام فضا میں فضا کلام کے پیچھے ہے زمین پر اور زمین کے نیچے ہے۔

کلام ایتھر کے بازوؤں پر ہے سمندر کی موجوں میں ہے جنگلوں اور غاروں میں ہے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہے۔ کلام ہر جگہ ہے! تو پھر سکون و اطمینان کا متلاشی کہاں جائے۔

کیا اس دنیا میں کوئی لوگوں کی جماعت ہے کہ میں اس میں شامل ہو جاؤں؟

کیا اللہ از روئے کرم، مجھے گراں گوشتی کے عطیہ سے نواز سکتا ہے کہ میں ابدی سکون کی جنت میں کامیاب زندگی بسر کروں؟

کیا اس وسیع و عریض کرہ ارض پر ایک گوشہ بھی ایسا نہیں جو زبان کی بکواس سے خالی ہو جہاں کلام فروخت کیا جاتا ہو، نہ خریدا جاتا ہو، عطا کیا جاتا ہو، نہ قبول کیا جاتا ہو؟ کاش! میں جانتا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو ازراہ کلام اپنے نفس کو نہیں پوجتا! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ خاک دان ہستی میں ایک انسانی جماعت ایسی بھی ہے جس کا منہ الفاظ کے ڈاکوؤں کا غار نہیں ہے!!

اگر بولنے والوں کی صرف ایک قسم ہوتی تو ہم مطمئن ہو جاتے اور ہمیں صبر آ جاتا لیکن ان کی قسمیں تو اتنی ہیں کہ شمار نہیں کی جا سکتیں۔

چنانچہ ایک جماعت تو ان ’مینڈکوں‘ کی ہے جو سارے دن جو ہڑوں میں پڑے رہتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو کنارے پر آ کر اپنا سر پانی سے نکالتے ہیں اور رات کے سینے کو اپنی اس ٹرٹڑ سے گراں بار کر دیتے ہیں، جسے سننے سے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور رو حیں بے چین ہو جاتی ہیں۔

اور ایک جماعت ان ’مچھروں‘ کی ہے (اور مچھر بھی جو ہڑ کی پیداوار ہیں) جو تمہارے کانوں کے گرد بھنھناتے ہیں ان کی پر شور مگر حقیر شیطانی بھنھناہٹ وہ ہے جسے آزار رسانی کے جذبہ نے پیدا کیا ہے اور شدید نفرت نے پروان چڑھایا ہے۔

اور ایک جماعت ان ’پسنہاروں‘ کی ہے (اور یہ عجیب و غریب جماعت ہے) جس میں سے ہر شخص کے باطن میں ایک پتھر ہوتا ہے جس کو گردش دی جاتی ہے تو اس سے ایک ایسی جہنمی گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے کہ اس کی ہلکی سے ہلکی آواز چکی کے پاٹوں کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔

اور ایک جماعت ان ’بیلوں‘ کی ہے جو اپنا پیٹ چارہ سے بھر کر گلیوں اور سڑکوں کے موڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور فضا کو اپنی ان دکاروں سے گراں بار کرنا شروع

کردیتے ہیں جو اگر انتہائی لطیف بھی ہوں تو بھینس کی ڈکار سے زیادہ ناگوار ہوتی ہیں۔

اور ایک جماعت ان ”لوؤں“ کی ہے جو اپنے اوقات ویرانوں اور قبروں میں گزارتے ہیں اور تاریکی کے سکون و سکوت کو اس چیخ و پکار سے بدل دیتے ہیں جس کا خوشگوار سے خوشگوار حصہ لو کی آواز سے زیادہ غم آفریں ہوتا ہے۔

اور ایک جماعت ان ”رہ کشوں“ کی ہے جنہیں زندگی لکڑی کے ماتر اشدہ نکلروں کی شکل میں نظر آتی ہے اور وہ اپنی ساری عمر ان نکلروں کے کاٹنے اور چھیلنے میں گزار دیتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے ایک عجیب سی کھکھراہٹ پیدا ہوتی ہے جو اگر حد درجہ شیریں بھی ہو تو آروں کی کھکھراہٹ سے زیادہ مکروہ ہوتی ہے۔

اور ایک جماعت ان ڈھول پیٹنے والوں کی ہے جو اپنی روحوں کو بڑی بڑی مو گریوں سے پیٹنے ہیں اور ان کے خالی منہ سے ایک ایسا شور بلند ہوتا ہے جو اگر بہت ہلکا ہوتا ہے تو ڈھول کی آواز سے زیادہ پریشان کن ہوتا ہے۔

اور ایک جماعت ان ”چبانے والوں“ کی ہے جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں آپس میں ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں بلکہ غیر شعوری طور پر آپ اپنی غیبت کرتے ہیں اور اس غیبت کو کہتے ہیں ظرافت۔ حالانکہ ظرافت سنجیدگی کی ایک قسم ہے لیکن وہ اس کو نہیں جانتے ہیں لیکن وہ عریاں کی عریاں رہتی ہے۔

اور ایک جماعت ان ”میناؤں“ کی ہے جن کے متعلق ایک شاعر کہتا ہے ”جب اڑنے والا اڑا تو میں یہ سمجھا کہ وہ شاہین ہو گیا۔“

اور ایک جماعت ان ”گھنٹوں“ کی ہے جو لوگوں کو تو عبادت گاہوں کی طرف بلاتے ہیں لیکن خود ان میں داخل نہیں ہوئے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی جماعتیں اور گروہ ہیں جو ہنوز شمار تعریف کی حدود سے باہر ہیں میرے خیال میں ان غیر معروف جماعتوں میں سب سے زیادہ عجیب ان

سونے والوں کی جماعت ہے جنہوں نے اپنے خزانوں سے فضائیں ہنگامہ برہا کر
رکھا ہے لیکن خود اس سے بے خبر ہیں۔



فلسفہ مرض

میری ایک داڑھ میں کیڑا لگ گیا تھا، جو مجھے طرح طرح سے پریشان کرتا۔ دن کے ہنگاموں میں اطمینان سے بیٹھ جاتا اور رات کی خاموشیوں میں جب دندان ساز خواب راحت کے مزے مین سرشار ہوتے اور دوا خانے بند.... بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔

ایک دن، جب کے میرے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا تو میں ایک دندان ساز کے پاس گیا اور کہا۔

”اس داڑھ کو نکال دیجئے، اس نے نیند کی لذت مجھ پر حرام کر رکھی ہے اور میری رات کے سکون و اطمینان کو آہ و کراہ سے بدل دیا ہے۔“

ڈاکٹر نے اپنا سر ہلایا اور جواب دیا۔

”جہالت ہوگی اگر ہم داڑھ کو نکال دیں جبکہ اس کا علاج ہو سکتا ہے۔“

اس نے ڈاڑھ کو ادھر ادھر سے کھرچنا شروع کیا اور اس کی ضروں کو صاف کر دیا۔ عجیب عجیب طریقوں سے روگ کو دور کرنے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ داڑھ میں اب ایک کیڑا بھی باقی نہیں رہا تو اس کے سوراخوں کو ایک خاص قسم کے سونے سے بھر دیا اور فخر آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

”اب تمہاری یہ داڑھ تندرست داڑھوں سے زیادہ مضبوط ہوگئی۔“

میں نے تائید کی اور اس کی جیب اشرفیوں سے بھر کر خوشی خوشی چلا آیا لیکن ابھی ایک ہفتہ نہ گزرنے پایا تھا کہ کم بخت داڑھ میں پھر تکلیف شروع ہوئی اور اس نے میری روح کے نغموں کو پھر قریب المرگ لوگوں کو خرخر اہٹ اور دوزخ کی چیخ و پکار سے بدل دیا۔

اب میں دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا اور محتاط لہجے میں اس سے کہا۔

”اس خطرناک سنہری داڑھ کا نکال پھینکنے.... تکلف بالکل نہ فرمائیے اس لئے کہ

کنکریاں چبانے والا انہیں شمار کرنے والوں سے مختلف ہوتا ہے۔“
 ڈاکٹر نے داڑھ نکال دی، وہ گھڑی اگرچہ درد و تکلیف کی بنا پر بڑی ہولناک تھی
 لیکن درحقیقت مبارک تھی۔

ڈاڑھ نکال دینے اور اچھی طرح دیکھ بھال کر لینے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔
 آپ نے بہت اچھا کیا.... کیڑوں نے اس داڑھ میں اچھی طرح جڑ پکڑ لی تھی اور
 اس کے اچھے ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔“

اس رات میں نہایت آرام سے سویا.... اب بھی آرام سے ہوں اور داڑھ کے نکل
 جانے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

انسانی سماج کے منہ میں بہت سی داڑھیں ہیں جن میں کیڑا لگا ہوا ہے اور یہ روگ
 اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ”عظیم الفت“ کی حد تک پہنچ گیا ہے لیکن انسانی سماج اس کی
 تکلیف سے بچنے کے لئے ڈاڑھیں نہیں نکلاتا۔ بلکہ محض لیپا پوتی پر اکتفا کرتا ہے
 اور انہیں باہر سے صاف کرا کے سوراخوں کو چمکدار سونے سے بھرا دیتا ہے اور بس!
 بہت سے طبیعت ہیں جو انسانیت کی داڑھوں کا علاج، نظر فریب سونے کے پانی
 اور چمک دار مادوں سے کرتے ہیں اور بہت سے مریض جو خود کو ان اصلاح پسند
 طبیعوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور بیماری کو تکلیف برداشت کرتے کرتے، بتنا
 نے فریب رہ کر مر جاتے ہیں۔

پھر وہ قوم جو ایک دفعہ بیمار ہو کر، مر جاتی ہے، دوبارہ زندہ نہیں ہو رہی کہ دنیا کے
 سامنے اپنے معنوی امراض کے اسباب اور ان اجتماعی دواؤں کی حقیقت بیان
 کرے جن کو استعمال کرنے سے قومیں زوال و نیستی کی منزل میں پہنچ جاتی ہیں۔



شامی قوم کے منہ میں بھی فرسودہ، سیاہ، گندی، اور بدبودار داڑھیں ہیں، ہمارے
 طبیعوں نے چاہا بھی کہ انہیں صاف کر کے ان کے سوراخوں کو چمکدار مادوں سے بھر

دیں اور اوپر سونے کا پانی چڑھا دیں لیکن روگ دور نہیں ہوا، اور کبھی نہیں ہو سکتا، جب تک ان داڑھوں کو اکھاڑ کر پھینک نہ دیا جائے پھر جس قوم کی داڑھ میں کوئی روگ ہو تو اس کا معدہ بھی ضعیف ہو جاتا ہے اور بہت سی قومیں ہیں، جو خرابی ہضم کا شکار ہو کر موت کے منہ میں جا چکی ہیں۔

اگر کوئی شام کیڑا لگی داڑھیں دیکھنی چاہتا ہے تو اسے مدرسہ میں جانا چاہئے جہاں مستقبل کا انسان ان مسائل کو یاد کر رہا ہے جو تھنیش نے سبویہ سے نقل کئے ہیں اور سبویہ نے سائق اطعمان سے۔

یاعدالت میں جانا چاہئے، جہاں بناوٹ، جھوٹ اور ریا کاری ہے۔

یا غریبوں کی جھونپڑیوں میں جانا چاہئے جہاں خوف، بزدلی اور جہالت ہے۔

اور اس کے بعد ان نرم و نازک انگلیوں والے دندان سازوں کے ہاں جانا چاہئے جن کے پاس باریک آلات اور نشہ آور سفوف ہیں اور جو کیڑا لگی داڑھوں کے سوراخ بھرنے ان کی گیلی جڑوں کو صاف کرنے میں اپنے اوقات بسر کرتے ہیں جب کوئی ان سے گفتگو کرتا ہے ان کی عطیوں سے نفع اندوز ہونا چاہتا ہے تو انہیں بزرگ خطیبوں میں سے پاتا ہے۔ جن کی زبان فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتی ہے جو جماعتیں بناتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں اور مجموعوں میں زور خطابت سے آگ لگا دیتے ہیں، کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں اور مجموعوں میں زور خطابت سے آگ لگا دیتے ہیں، جن کی تقریروں میں ایک نغمہ سے زیادہ بلند اور جولانی کی راتوں میں میندک کی ٹراہٹ سے زیادہ دلکش۔

لیکن جب کوئی ان سے کہتا ہے۔

”شامی قوم اپنی زندگی کی غذا، کیڑا لگی داڑھوں سے چباتی ہے اس لئے اس کے ہر لقمہ میں زہر یا لعاب شامل ہو جاتا ہے اور اس زہریلے لعاب نے اس کے آنتیں تقریباً بیکار کر دی ہیں۔“

جب کوئی ان سے یہ کہتا ہے تو وہ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔
”جی ہاں اس کے لئے ہم ایک نئی دوا کی ایجاد میں مصروف ہیں، جو بہت زیادہ
نشیپ آور ہوگی۔“

اور کہنے والا جب یہ کہتا ہے کہ
”ان داڑھوں کو نکلوا دینے کے متعلق آپ کا خیال ہے؟“
تو وہ قہقہہ لگاتے ہیں اس لئے اور صرف اس لئے کہ انہوں نے دانتوں کا شریفانہ
علاج نہیں سیکھا۔

سوال کے دہرائے جانے پر وہ اتھ کھڑے ہوتے ہیں اور بیزارگی کے لہجے میں
اپنے دل سے کہتے ہیں۔
”کس قدر میں دنیا میں خیال کے بندے اور کتنے بے بنیاد ہیں ان کے خیال؟“



فلسفہ سوگ

میرے عزیز مر گئے اور میں زندگی کی قید میں گرفتار، وحدت و تنہائی کے عالم میں ان پر ماتم کر رہا ہوں!

میرے دوست مجھ سے بچ گئے اور میری زندگی ان کے بعد غم و آلام کی منہ بولتی تصویر بن کر رہ گئی۔

میرے عزیز اور دوست موت کی نیند سو گئے اور میرے وطن کی پہاڑیاں اشک و خون میں نہا گئی۔ لیکن میں یہاں ای طرح زندگی بسر کر رہا ہوں جس طرح زندگی کے شانوں اور آفتاب کی شعاعوں سے روشن پہاڑوں پر اچھلنے کودنے والے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بسر کرتا تھا۔

میرے عزیز فاقوں سے مر گئے اور جو بچ گیا وہ تلوار کے گھاٹ اتار دینے گئے لیکن میں ان لوگوں میں چل پھر رہا ہوں جو مسرور ہیں، شاد کام ہیں، اچھی سے سچھی غذائیں کھاتے ہیں۔ بہتر سے بہتر شرابیں پیتے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ مسہریوں پر سوتے ہیں، جو زندگی سے خوش ہوتے ہیں اور رجن سے زندگی خوش ہوتی ہے۔

میرے عزیز نہایت ذلت و حقارت کی موت مر گئے لیکن میں یہاں راحت و سلامتی کی زندگی گزار رہا ہوں اور یہی وہ المناک ڈرامہ ہے جو میری روح کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔

اگر میں اپنے بھوکے عزیزوں میں بھوکھا ہوتا یا اپنی مظلوم قوم کے ساتھ جو رُو ظلم برداشت کرتا تو دونوں کا دباؤ، میرے سینہ پر اتنا شدید نہ ہوتا اور راتیں میری نگاہ میں اتنی سیاہ نہ ہوتیں اس لئے کہ جو کئی مصیبت دے چارگی میں اپنے عزیزوں کا ساتھ دینا ہے وہ ایک ایسی مقدس تسکین محسوس کرتا ہے جو اپنے وجود کے لئے جذبہ شہادت کی مرہون منت ہوتی ہے بلکہ وہ اپنی ذات پر فخر کرتا ہے۔ میں بے گناہوں کے ساتھ بے گناہ مر رہا ہوں لیکن میں اپنی بھوکے اور مظلوم قوم کے ساتھ نہیں جبکہ وہ

موت کے جلوں کے ہمراہ شہادت کی بلندیوں کی طرف جارہی ہے بلکہ یہاں...سات سمندر پار... اطمینان کے سائے اور سلامتی کے گہوارہ میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

یہاں میں مصیبت اور مصیبت زدوں سے دور ہوں اور کسی چیز، یہاں تک کہ اپنے آنسوؤں پر بھی فخر نہیں کر سکتا۔

ایک پردیسی، جو اپنے وطن سے کوسوں دور ہو، بھوکے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔

کاش میں جانتا، شاعر کے نالہ و ماتم کا ناندہ کیا ہے؟
اگر میں خاک وطن میں گہیوں کا پودا ہوتا تو بھوکا بچہ مجھے تو ڈر کر میرے دانوں کے ذریعہ دست اجل کو اپنے سینہ سے ہٹا دیتا۔

اگر میں اپنے ملک کے باغوں کا پختہ پھل ہوتا تو بھوکے عورت مجھے کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھالیتی!

اگر میں اپنے وطن کی فضا میں پرندہ ہوتا تو بھوکا مرد مجھے شکار کر کے میرے جسم کی بدولت اپنے جسم سے قبر کا سایہ دور دیتا۔

لیکن آہ! کتنی پچا رنگی اور افسوس کا مقام ہے کہ میں ششام کے کھیتوں میں گیہوں کا پودا ہوں، نہ لبنان کی وادیوں کا پختہ پھل!!

اور یہی وہ خاموش ابتداء ہے جس نے مجھے خود میرے اور رات کی پرچھائیوں کے سامنے حقیر کر دیا ہے۔ یہی وہ المناک کہانی ہے جس نے میری زبان اور ہاتھوں کو جکڑ کے مجھے اس حالت میں کھڑا کر دیا ہے کہ نہ میرے پاس عزم و ارادہ ہے نہ عمل۔



لوگ مجھے کہتے ہیں۔

”تمہارے ملک کی بربادی کیا ہے سوائے دنیا کے ایک حقیر حصہ کی بربادی کے اور وہ اشک و خوں جو تمہارے ملک میں بہا کیا ہے سوائے اس جوئے اشک و خوں کے چند قطروں کے جو دن رات کرہ ارض کے میدانوں اور وادیوں سے پھوٹی رہتی ہے!“

سچ ہے! لیکن میرے ملک کی بربادی، خاموش بربادی ہے! میرے ملک کی بربادی وہ گناہ ہے جس کے نتیجے میں سانپ اور اڑدھے پیدا ہوتے ہیں میرے ملک کی بربادی وہ ٹریجڈی ہے جس میں نغمے ہیں نامناظر!!

اگر میری قوم بے ایمان و غابا زحاکموں کے خلاف بغاوت کرتی اور سرکشی کر جرم میں ماری جاتی تو میں کہتا کہ آزادی کی راہ میں مرنا غلامی کے سائے میں جینے سے بہتر ہے اور جو شخص ہاتھ میں تلوار لئے موت سے گلے ملتا ہے وہ حق کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔“

اگر میرا وطن قومی جنگ میں حصہ لیتا اور اس کا ایک ایک بچہ میدان جنگ میں کام آجاتا تو میں کہتا کہ میری قوم ایک تند و تیز آندھی ہے جو اپنی قوت سے سبز اور خشک ٹہنیوں کو ایک ساتھ توڑ پھینکتی ہے اور طوفانی شاخوں میں دب کر مر جاوا، بڑھاپے کی آغوش میں مرنے سے بہتر ہے۔“

اگر دنیا میں کوئی زبردست زلزلہ آتا جس کے اثر سے میرا ملک بالکل الٹ جاتا اور میرے عزیز آسامی میں دب جاتے تو میں کہتا ”یہ مخفی قوانین ہیں جن کو حرکت میں لانے کی ذمہ دار وہ قوت ہے جو انسانی قوتوں سے ارفع و اعلیٰ ہے اس لئے جہالت ہوگی اگر ہم اس کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

لیکن میرے عزیز واقارب بغاوت کے جرم میں نہیں مرے، آزادی کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے ہلاک نہیں ہوئے ان کا ملک زلزلہ نے تناہ نہیں کیا بلکہ وہ غلامی کے گناہ میں مار گئے۔

میرے رشتہ دار سولی پر چڑھادینے گئے۔

وہ مرے اور اس حالت میں ان کے ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں فضا کی تاریکی پر جمی ہوئی تھیں!

وہ مرے اور بے زبانی و خاموشی کے عالم میں مرے اس لئے کہ انسانیت کے کان ان کی چیخ و پکار کی طرف سے بند تھے۔

وہ مرے اس لئے کہ اپنے دشمنوں سے بزدلوں کی طرف محبت اور اپنے چاہنے والوں بے دینیوں کی طرف نفرت نہ کر سکے۔

وہ مرے اس لئے کہ گناہ گار نہ تھے۔

وہ مرے اس لئے کہ انہوں نے ظالموں پر ظلم نہیں کیا۔

وہ مرے اس لئے کہ امن پسند تھے۔

وہ مرے اور اس سرزمین پر بھوکے مرے جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔
وہ مرے اس لئے کہ جہنمی اژدھے ان کے کھیتوں کے سارے مویشی اور مودی خاندانوں کا سارا نالج ہڑپ کر گئے۔

وہ مرے اس لئے کہ سانپوں..... پشیمنی سانپوں..... نے اس فضا کو اپنی پھنکاروں سے مسموم کر دیا، جو چینیلی گلاب اور صنوبر کی خوشبوؤں سے معطر تھی۔

اے اہل شام میرے اور تمہارے عزیز و اقارب مر گئے، تاؤ اب ہم ان کے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ جو موت کے چنگل سے بچ گئے ہیں؟

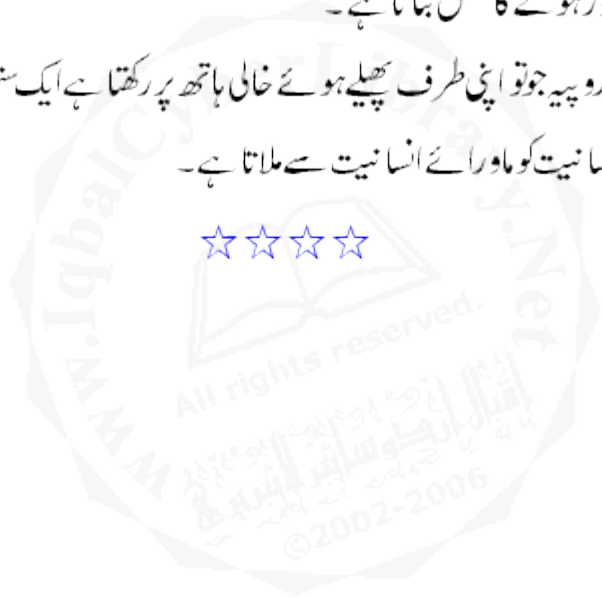
ہماری آئیں ان کے دام واپس کون نہیں روک سکتیں اور ہمارے آنسو ان کی شدید پیاس نہیں بجھا سکتے!

تو پھر ہم انہیں بھوک انہیں بھوک اور پیاس سے کیسے نجات دلائیں۔“

کیا ہم شک و تردید اور غفلت اور بے پرواہی کے عالم میں اس المناک حادثہ کی طرف سے آنکھیں بند کئے یا زندگی کے حقیر اور معمولی کاموں میں مصروف رہیں؟

اے میرے شامی بھائی! وہ جذبہ، جو تجھے اپنے لب گور بھائی کی امداد کے لئے
ابھارتا ہے ایک عدیم المثل امتیاز ہے جو تجھے دن کی روشنی اور رات کی خاموشی سے
لطف اندوز ہونے کا مستحق بتاتا ہے۔

اور وہ روپیہ جو تو اپنی طرف پھیلے ہوئے خالی ہاتھ پر رکھتا ہے ایک سنہری حلقہ ہے
جو تری انسانیت کو ماورائے انسانیت سے ملاتا ہے۔



فلسفہ محرومی

رات کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔

رات کی تاریکیوں میں ہم چلاتے ہیں، فریاد کرتے ہیں اور موت کا سایہ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اس کے سیاہ بازو ہم پر چھائے ہوتے ہیں اور اس کا خوفناک ہاتھ ہماری روحوں کو جہنم کی طرف گھسیٹتا ہے لیکن اس کی آتشیں نگاہیں، دور افت پر جمی ہوتی ہے۔

رات کی تاریکیوں میں موت گرفتار ہوتی ہے اور ہم خوف و دہشت سے آہ زاری کرتے، اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، ہم میں کوئی نہیں ہوتا جو ٹھہر سکے، یا جس کے دل میں ٹھہرنے کی آرزو ہو۔

رات کی تاریکیوں میں موت ہمارے آگے آگے ہوتی ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے جب کبھی وہ پلٹ کر دیکھتی ہے ہم میں ہزاروں سڑک کے کنارے گر پڑتے ہیں اور جو گر جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ پھر کبھی نہیں اٹھتا اور جو نہیں گرتا وہ اپنے ارادوں کے خلاف چلتا رہتا ہے یہ جانتے ہوئے کہ وہ گرے گا اور سونے والوں کے ساتھ سوئے گا لیکن موت؟..... وہ دور افت پر نگائیں جمائے چلتی رہتی ہے۔

رات کی تاریکیوں میں بھائی اپنے بھائی کو، باپ اپنے بیٹوں کو اور ماں اپنے بچے کو پکارتی ہے اور ہم سب کے سب بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے ہوتے ہیں، لیکن موت، نہ بھوک کی ہوتی ہے، نہ پیاسی اس لئے کہ اس کی غذا سامان ہماری روح اور جسم اور اس کی پیاس کا سامان ہمارے آنسو اور خون ہیں۔ پھر بھی اس کا پیٹ اچھی طرح بھرتا نہ پیاس بجھتی ہے۔

رات کے ابتدائی حصہ میں بچہ ماں کو پکار کر کہتا ہے۔

”اماں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

اور ماں جواب دیتی ہے۔

”بیٹا! تھوڑی دیر صبر کر!“

آدھی رات کو بچہ پھر ماں کو آواز دیتا ہے۔

”اماں میں بھوکا ہوں، مجھے روٹی کھلا دو!“

اور جواب میں کہتی ہے۔

”بیٹا! میرے پاس روٹی نہیں ہے!“

بچھلی رات کو موت، ماں اور اس کے بچے کے پاس سے گزرتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے چت رسید کرتی ہے، وہ سڑک کے کنارے سو جاتے ہیں لیکن موت دورانق پر نگاہیں جمائے چلتی ہے۔

صبح کو مرد رزق کی تلاش میں کھیت کی طرف جاتا ہے لیکن وہاں خاک اور پتھر کے سوا کچھ نہیں پاتا۔

دوپہر کو وہ تھکا ماندہ خالی ہاتھ اپنے بیوی بچوں کے پاس آجاتا ہے اور جب شام ہوتی ہے تو موت مرد اور اس کے بیوی بچوں کے پاس سے گزرتی ہے اور انہیں ستا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور پھر دورانق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے۔

صبح کو کسان اپنی جھونپڑی سے نکلتا ہے اور اپنی ماں بہنوں کا گھنٹا لے کر شہر میں جاتا ہے کہ اسے فروخت کر کے گیہوں خریدے، لیکن جب سہ پہر کو وہ ایسی حالت میں کہ اس کے پاس سامان خور و نوش ہوتا ہے نہ گھنٹا، اپنے گاؤں واپس آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ماں بیٹیاں سو رہی ہیں مگر ان کی نگاہیں ایک موہوم نقطہ پر جمی ہیں، اس پرندہ کی طرح جسے صیاد کے تیر نے گرا لیا ہو، وہ اپنے بازو کبھی آسمان کی طرف اٹھاتا ہے کبھی زمین کی طرف گراتا ہے، شام کو موت، کسان اور اس کی ماں پہنوں کے پاس سے گزرتی ہے اور انہیں سوتا دیکھ کر مسکراتی ہے پھر دورانق پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہیں۔

رات کی تاریکیوں میں..... اور رات کی تاریکیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ اے روشنی

میں چلنے پھرنے والو! ہم تمہیں پکارتے ہیں لیکن کیا تم ہماری پکار سنتے ہو؟
ہم نے اپنے مردوں کی روحوں کو پیغامبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا، لیکن جو کچھ
انہوں نے کہا، کیا وہ تمہارے دماغوں میں محفوظ ہے؟

ہم نے اپنے مردوں کی روحوں کو پیغامبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا، لیکن جو کچھ
انہوں نے کہا، کیا وہ تمہارے دماغوں میں محفوظ ہے؟

ہم نے مشرقی ہواؤں کو اپنے انفاس سے گراں بار کیا لیکن کیا وہ ہوائیں تمہارے
دور دراز ساحلوں تک پہنچیں اور انہوں نے اپنا بھاری بوجھ تمہارے سامنے رکھا؟
کیا تم نے ہماری مصیبت کا اندازہ کر سکتے ہمیں اس سے نجات دلانے کی کوشش
کی؟ یا خود کو امن و سلامتی میں پا کر کہہ دیا۔

”روشنی کے رہنے والے ظلمت زادوں کے ساتھ اس کے سوا اور کیا سلوک کر سکتے
ہیں کہ مردوں کو بلائیں اور ان سے کہیں کہ ان چلتی پھرتی لاشوں کو دفن کر دو، تاکہ
مشیت الہی کی تکمیل ہو جائے!“

لیکن کیا تم اپنے تئیں موجودہ سطح سے بلند نہیں کر سکتے تاکہ خدا تم کو اپنی مشیت بنا
لے اور ہمارے معاون و مددگار ہو جاؤ۔“

رات کی تاریکیوں میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے ہیں؟

رات کی تاریکیوں میں بھائی اپنے بھائی کو، ماں اپنے بیٹھے کو، شوہر اپنی بیوی کو اور
عاشق اپنی محبوبہ کو پکارتا ہے اور جب ہماری آوازیں آپس میں گھل کر فضا کے جگر کی
طرف بلند ہوتی ہیں تو موت ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر ہم پر ہنستی ہے اور ہمارا مذاق
اڑاتی ہے، پھر دور افتخ پر نگاہیں جمائے چلی جاتی ہے!“



فلسفہ قانونِ فطرت

کتنا عجیب ہے زمانہ اور کتنے عجیب ہیں ہم!

زمانہ بدلا اور اپنے ساتھ ہمیں بھی بدل گیا۔ اس نے ہماری رہنمائی کی اور ہم اس کے ساتھ ساتھ ہو گئے۔ اس نے چہرے سے نقال الٹی اور ہم سب کچھ بھول کر مسرت درآغوش ہو گئے!

کل تک ہم زمانے سے ڈرتے اور اس کی شکایت کرتے تھے، لیکن آج اس کے دوست ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں بلکہ اس کی فطرت و غایت اور اسرار و رموز کو سمجھنے لگے ہیں۔

کل تک ہم بچتے بچاتے، چھپتے چھپاتے ریگتے تھے۔ ان پر چھائیوں کی طرح، جو رات کی ہول آفرینیوں اور دن کی خوفناکیوں کے درمیان لڑتی کا پختی ہیں، لیکن آج کو ہستانی راہوں پر دندناتے پھرتے ہیں جو تند و تیز آندھیوں کی کمین گاہیں اور برق و رعد کا سرچشمہ ہیں۔

کل تک ہم خون سے گندھی ہوئی روٹی کھاتے اور آنسو ملا پانی پیتے تھے لیکن آج صبح پریوں کے ہاتھ سے من و سلوٹی کھاتے اور بہار کی عطربیزیوں سے معطر شراب پیتے ہیں۔

کل تک ہم تقدیر کے ہاتھ کا کھلونا تھے اور تقدیر، طاقت و قوت کے نشہ میں چور ہمیں جس طرح چاہتی، نچاتی تھی، لیکن آج جب کہ اس کا نشہ اتر چکا ہے، ہم اس کے ساتھ کھیلتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ کھیلتی ہے ہم اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ کھیلتی ہے ہم اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور وہ ہنستی ہے۔ ہم اس کی قیادت کرتے ہیں اور وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

کل تک ہم بتوں کے سامنے خوشبوئیں ساگاتے اور غضب ناک دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھاتے تھے لیکن آج اپنی روح کے سوا کسی کے سامنے خوشبوئیں نہیں

سلاگاتے اور ذات کے سوا، کسی پر بھیٹ نہیں چڑھاتے۔ اس لئے کہ سب سے بڑے اور سب سے حسین دیوتا ہمارے سینہ کو اپنی جلوہ گاہ بنا لیا ہے۔

کل تک ہم بادشاہوں سے ڈرتے تھے اور ہماری گردنیں ان کے سامنے خم ہو جاتی تھیں لیکن آج حق کے سوا، کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتے، حسن کے سوا، کسی کی اطاعت نہیں کرتے اور محبت کے سوا کسی کے آرزو مند نہیں ہوتے۔ کل تک ہماری نگائیں پادری کے چہرہ پر نہ پڑ سکتی تھیں اور ہم نجومیوں کو دیکھتے ہوئے خوف محسوس کرتے تھے۔ لیکن آج جب کے زمانہ اور زمانہ کے ساتھ ہم بدل چکے ہیں۔ سورج کے سوا کسی پر نگاہیں نہیں جماتے۔ سمندر کے نغمہ کے سوا کوئی آواز نہیں سنتے اور گولوں کے سوا کسی کے ساتھ جہنش نہیں کرتے۔

کل تک ہم اپنی روح کے محل ڈھاتے تھے تا کہ ان کی بنیادوں پر اپنے آباؤ اجداد کی قبریں تعمیر کریں لیکن آج ہماری روح مقدس قربان گاہ ہے جس کے قریب گزرے ہوئے زمانہ پر چھائیاں آسکتی ہیں نہ اسے موت کی بوسیدہ انگلیاں چھوسکتی ہیں۔

ہم نسیان و فراموشی کے گوشوں میں چھپی ہوئی خاموش فکر تھے لیکن اب بلند آواز ہیں جو فضا کی گہرائیوں میں لرزش پیدا کر دیتی ہے۔

ہم راکھ میں دبی ہوئی چھوٹی سی چنگاری تھے لیکن اب بھڑکتی ہوئی آگ ہیں جس نے وادیوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔

ہم نے کتنی راتیں گم شدہ محبت کردہ رزق کے لئے روتے ہوئے جاگ کر کائی ہیں اس طرح کہ زمین ہمارا بستر تھی اور برف ہمارا الحاف ہم نے کتنے دن بیٹھے بیٹھے گزارے ہیں۔ بھیسروں کے اس ریوڑ کی طرح جس کا چرواہانہ ہوا اور اس حالت میں کہ ہم اپنے افکار کو دانتوں سے توڑتے اور اپنے جذبات کو داڑھوں میں چباتے تھے لیکن پھر بھی بھوکے کے بھوکے اور پیاسے کے پیاسے ہی رہتے تھے۔ ہم کتنی

مرتبہ دونوں وقت ملتے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس عالم میں کہ شباب رفتہ کا ماتم کرتے تھے۔ ایک انجان چیز کی تمنا میں جان دیتے تھے۔ نا معلوم اسباب کی بنا پر وحشت زدہ ہوتے تھے خالی اور تاریک فضا کو ٹکلی باندھ کر دیکھتے تھے اور سکون و مستی کی آہ دغاں پر کان لگاتے تھے۔

لیکن وہ زمانہ گزر گیا جس طرح بھیڑ یا قبرستان سے گزر جاتا ہے اور آج جب کہ فضا بھی صاف ہے اور ہم بھی صحت مند ہم اپنی روشن راتیں شاندار مسہریوں پر گزارتے ہیں۔ اس طرح کہ خیال کے ساتھ جاگتے ہیں، فکر کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور امیدوں سے گلے ملتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں اور ہم انہیں اپنی غیر مرغوش انگلیوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ ہر طرف جنوں کے سائے نمودار ہوتے ہیں اور ہم ان سے غیر مشتبہ زبان میں گلگو کرتے ہیں۔ فرشتوں کے گر وہ ہمارے پاس سے گزرتے ہیں اور انہیں اپنے دل کے شوق سے لہاتے اور اپنی روح کے نغموں سے مخمور کرتے ہیں۔

ہم کل یہ تھے اور آج یہ ہیں اور یہی اپنی اولاد کے متعلق دیوتاؤں کی مرضی ہے! لیکن اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟ اے ابلیس زادو!

جب تم زمین کے شگافوں سے نمودار ہوئے ہو، ایک قدم بھی تم نے آگے کی طرف بڑھایا؟ جب سے شیطانوں نے تمہاری آنکھیں کھولی ہیں کبھی بلندی کی طرف تم نے نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا؟ جب سے سانپوں کی پھنکار نے تمہارے ہونٹ چومے ہیں، ہتھ کی راہ میں ایک کلمہ بھی تم نے اپنی زبان سے نکالا؟ جب سے موت نے تمہارے کانوں میں روئی ٹھونسی ہے ایک لمحے کے لئے بھی تم نے زندگی کے نغمہ پر کان لگائے؟

ستر ہزار (70,000) برس پہلے میں نے تمہیں دیکھا تو اس وقت بھی تم کیڑے مکوڑوں کی طرح ناروں کے گوشوں میں ریگ رہے تھے اور اب اتنی طویل مدت

کے بعد، سات منٹ ہوئے کہ میں نے اپنی کھڑکی کے شیشہ میں سے تم پر نگاہ ڈالی۔
سواب بھی تم ناپاک گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہو۔ گمنامی کے شیطان تمہاری
رہنمائی کر رہے ہیں۔ غلامی کے بیڑیاں تمہارے پاؤں میں پڑی ہیں اور موت
تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔

تم آج بھی وہی ہو جو کل تھے اور کل اور اس کے بعد بھی ویسے ہی رہو گے جیسا میں
نے شروع میں تمہیں دیکھا تھا۔

لیکن ہم کل یہ تھے اور آج یہ ہیں اور یہی اپنی اولاد کے متعلق دیوتاؤں کا قانون
ہے۔

مگر اے ابلیس زاوو! تمہارے متعلق ابلیس کا قانون کیا ہے؟



فلسفہ عرفان نفس

بیروت کی ایک برشگالی رات میں سلیم آفندی اپنی میز کے پاس بیٹھا جس پر وہ پرانی کتابوں اور کاغذوں کا انبار لگاتا تھا۔ کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی سر اٹھا کر اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے سگریٹ کا دھون چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے فلسفہ کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی جو سقراط نے اپنے محبوب شاگرد افلاطون کے لئے ”عرفان نفس“ کے موضوع پر لکھی تھی۔

سلیم آفندی وہ نہیں کتاب پڑھ رہا تھا اور فلاسفہ متقدمین کے وہ اقوال یاد کر رہا تھا جو اس موضوع سے متعلق تھے، یہاں تک کہ مشرقی اور مغربی منکرین کے تمام نظریات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے اور اس کی ذات ”عرفان نفس“ کی گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔

اچانک وہ چونکا اور انگڑائی لے کر بلند آواز میں کہنے لگا۔

”ہاں! ”عرفان نفس“ ہی معارف عالیہ کا سرچشمہ ہے، اس لئے مجھ پر فرض ہے کہ میں اپنی ذات کو پیمانوں، اس کی تمام حقیقتوں سے واقف ہوؤں، اس کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو سمجھوں، مجھ پر واجب ہے کہ اسرار نفس سے پردہ اٹھاؤں اور اپنے دل کے بھیدوں کے متعلق جو شبہ مجھے ہے اسے دور کروں بلکہ میرے لئے ناگزیر ہے کہ اپنے وجود معنوی کی غایت اپنے وجود ظاہری کو بتاؤں اور اپنے وجود ظاہری کے اسرار اپنے وجود معنوی پر منکشف کروں!“

یہ کلمات اس نے ایک عجیب جوش کے ساتھ ادا کئے، اس کی آنکھوں میں عرفان نفس کی محبت کے شعلے بھڑک رہے تھے اس کے بعد وہ سامنے والے کمرے میں گیا اور آئینے کے سامنے جو کمرے کے فرش کو چھت سے ملتا رہا تھا، بت کی طرح ساکت و صامت کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اپنے عکس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنے چہرے کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے سر، اپنے قد اور اپنی مجموعی ہیئت کا اچھی طرح جائزہ

لے رہا تھا۔

وہ آدھ گھنٹہ تک اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ گویا ازلی فکر نے اس پر وہ افکار نازل کر دیئے ہیں جو اپنی بلندی کی بنا پر ہولناک ہیں اور جن کے واسطے وہ اپنی روح کی گتھیاں سلجھا سکتا اور اپنی ذات کی خلاؤں کو روشنی سے لبریز کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے لب و اکٹے اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

”میں کوتاہ قد ہوں اور اسی طرح نیولین اور وکٹریوں کو بھی کوتاہ قد تھے۔ میری پیشانی تنگ ہے اور اسی طرح سقراط اور اسپینوز کی پیشانی بھی تنگ تھی۔

میرے سر کے اگلے حصہ کے بال اڑ ہوئے ہیں اور یہی حال شیکسپیر کا تھا۔

میری ناک لمبی اور ایک طرف جھکی ہوئی ہے اور اسی طرح سفیر و لاوالییر اور جارج واشنگٹن کی ناک لمبی اور ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔“

میری آنکھ میں عیب ہے اور اسی طرح سینٹ پال اور نشے کی بھی آنکھ میں عیب تھا۔

میرے ہونٹ موٹے اور نیچے کا ہونٹ آگے نکلا ہوا تھا اور ای طرح سیرین اور لوئی چہاردہم کے بھی ہونٹ موٹے اور نیچے کا نٹ آگے نکلا ہوا تھا۔ میری گردن موٹی ہے اور اسی طرح ہانی بال اور مارکس انطونیو کی گردن بھی موٹی تھی۔

میرے کان لمبے اور وحشیوں کی طرح جھکے ہوئے تھے۔

میرے رخسار کی ہڈی ابھری ہوئی ارکلی پچکے ہوئے ہیں اور یہی کیفیت لافیات اور لنکن کی تھی۔

میری ٹھوڑھی دھنسی ہوئی ہے اور اسی طرح گولڈ سمتھ اور ولیم کی ٹھوڑھی بھی دھنسی ہوئی تھی۔

میرے کندھے اونچے نیچے ہیں اور اسی طرح گونے اور ادیب اسحاق کے

کندھے بھی اونچے نیچے تھے۔

میری ہتھیلیاں بھدی اور انگلیاں چھوٹی ہیں اور یہی حالت بلیک اور دانستے کی تھی۔

مختصر یہ کہ میرا جسم کمزور اور بلا پتلا ہے اور یہ ان منکرین کی خصوصیت ہے جنہوں نے اپنی جسمانی قوتیں، ذہنی مقاصد کے حصول میں صرف کی ہیں۔

حیرت ہے کہ بلزاک کی طرح جب تک میرے پہلو میں قہوہ کی کیتلی نہ ہو، میں لکھ پڑھ نہیں سکتا، علاوہ ازیں میسکسم گور کی اور نالستانی کی برج مجھے بھی ہاتھ منہ دھوئے دو دن ہو جاتے ہیں۔

ان سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ بوکاشیو اور یالے کی طرح مجھے بھی عورتوں کے حالات معلوم کرنے میں لطف آتا ہے بالخصوص ان کی حرکات دریافت کرنے میں جو وہ اپنے شوہروں کی غیر موجودگی میں کرتی ہیں۔

اب صرف دو سوال رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں شراب کا رسیا کیوں ہوں؟ اور دوسرا یہ کہ مجھے مرغن غذاؤں اور انواع و اقسام کے کھانوں سے چنے ہوئے دستر خوان کیوں پسند ہیں۔ جواب یہ ہے کہ میرا پہلا شوق ابونواس، ڈی موسہ، اور مارکو کے شوق سے مشابہ ہے اور دوسرا شوق ہم پطرس اعظم اور سلطان بشیر شہابی کے شوق سے ملتا جلتا ہے۔

سلیم آفندی تھوڑی دیر کے لئے رک گیا اور پھر اپنی پیشانی پکڑ کر کہنے لگا۔

”یہ ہوں میں، اور یہ ہے کہ میری حقیقت۔ بالفاظ دیگر میں ان تمام خوبیوں کا مالک ہوں، جو تاریخ کے آغاز سے لے کر اس زمانے تک بڑے بڑے آدمیوں کا طغرائے امتیاز رہی ہیں اور اس نوجوان کے لئے جس میں یہ خصوصیات موجود ہوں۔ ضروری ہے کہ وہ اس دنیا میں کوئی بڑا کام کرے۔

عرفان نفس، حکمت و فلسفہ کا مقصد اعلیٰ ہے اور میں نے آج کی رات اپنے نفس کا

عرفان حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے میں آج ہی کی رات سے وہ عظیم الشان کام شروع کر دوں گا جس کی طرف مجھے اس عالم کی حقیقت بلا رہی ہے..... وہ حقیقت جو مختلف اور متعدد عناصر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔“

میں نے نوح سے لے کر سقراط اور بوکاشیو سے لے کر احمد فارس شذیاق تک کے بڑے بڑے لوگوں کی ہمراہی اختیار کر لی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ عظیم الشان کام کیا ہے۔ جو میرے ہاتھوں انجام پذیر ہوگا؟ لیکن وہ مرد جس کی شخصیت ظاہری اور ذات معنوی میں وہ تمام صفات موجود ہوں جو مجھ میں ہیں، قطعی طور پر ”معجزات زمانہ“ میں سے ہونا چاہئے۔

میں نے خود کو پہچان لیا۔ ہاں! دیوتاؤں کی قسم! میں نے اپنی ذات کو پہچان لیا۔ اس لئے مجھے زندہ، میری ذات کو قائم اور اس کائنات کو کائنات کی حیثیت سے اس وقت تک باقی رہنا چاہئے جب تک میں اپنا کام ختم نہ کر لوں۔

سلیم آفندی کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے گھناؤنے چہرے پر مسرت کے آثار تھے اور وہ ایک ایسی آواز میں جس کا بلند آہنگی سے وہی تعلق تھا جو بلی کی میاؤں میاؤں کو ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ہوتا ہے ابوالعلماء معری کا یہ شعر بار بار پڑھ رہا تھا۔

میں اگر آخری زمانے میں پیدا ہوا ہوں

لیکن وہ کام کروں گا جو میرے پیشرو نہ کر سکے

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے دوست بالباس پریشان، اپنی جھلنگی چارپائی پر محو خواب تھے اور ان کے خراٹے فضا کو ایک ایسے نغمہ سے گراں بار کر رہے تھے جو آدمی کی آواز کے مقابلہ میں چکی کی گھر گھرہٹ سے زیادہ قریب تھا۔



فلسفہ قہر

روشنائی سے لکھنے والا، خون دل سے لکھنے والے کی برابری نہیں کر سکتا۔
اور وہ خاموشی، جو ناکامی و اداسی کی ترجمان ہے اس خاموشی کی ہم مرتبہ نہیں ہو سکتی
جو رنج و غم کی تخلیق کرتی ہے۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی، اس لئے کہ دنیا کے کان کمزوروں کی آہ زاری سے
ہٹ کر دوزخ کی چیخ و پکار پر لگ گئے اور دانائی اسی میں ہے کہ جن ضمیر و جود میں
چھپی ہوئی قوتیں.... وہ قوتیں جن کی زبان تو پیس ہیں اور الفاظ بم کے گولے.... بر
سر تکلم ہوں تو کمزور خاموش ہو جائے۔

ہم آج کل اس زمانہ میں ہیں، جس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ اپنے پیش روزمانہ
کے بڑی سے بڑے حصہ سے بڑا ہے، اس لئے وہ امور جن میں ہمارے افکار، میلا
نات اور جذبات الجھے رہتے تھے، ایک گوشہ میں سمٹ کر رہ گئے ہیں اور وہ مشکلات و
مسائل جو ہمارے عقیدوں اور اصولوں سے کھیلتے تھے نسیان و فراموشی کے پردہ میں
چھپ گئے ہیں۔

رہے وہ لطیف خیالات اور دکھ سائے جو ہمارے محسوسات کے اسٹیج پر رقصاں
تھے۔ سو وہ کہری کی طرح فضا میں منتشر ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ ان قہر مانی قوتوں
نے لے لی ہے جو آندھیوں کی طرح چلتی، سمندروں کی طرح اٹھلاتی اور کوہ آتش
فشاں کی طرح سانس لیتی ہیں۔

لیکن ان قہر مانی قوتوں کا مقابلہ ختم ہو جانے کے بعد، دنیا کس طرح جائے گی؟
کیا کسان اپنے اس کھیت میں واپس آ کر کھیتی باڑی کرے گا جہاں موت نے
مقتولوں کی کھوپڑیاں بوئی ہیں؟

کیا چرواہا اپنے گلے کو اس چراگہ میں چرائے گا جس کی زمین پرتواریوں نے جگہ
جگہ چگاف ڈال دینے ہیں؟ کیا وہ اپنے ریوڑ کو ان چشموں کے کنارے لے جائے

گا جن کے پانی میں تازہ تازہ خون شامل ہے۔

کیا عابد اس نیکل میں نماز عبودیت ادا کرے گا جہاں شیطان ناچ رہے ہیں، کیا شاعر اپنا قصیدہ ان ستاروں کے سامنے پڑھے گا جنہیں دھوئیں نے چھپا رکھا ہے؟ کیا معنی اس رات میں اپنے گیت سنائے گا جس کی خاموشی ہولنا کیوں سے گھل رہی ہے۔

کیا ماں اپنے شیر خوار بچے کے پنکوڑھ کے پاس بیٹھ کر اسے لوریاں دے گی اور آنے والے دن کی خوفناکیوں سے لرزہ براندام نہ ہوگی؟
کیا عاشق اپنی محبوبہ سے ملے گا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کریں گے جہاں دشمن اپنے دشمن کے مقابلہ پر آ کر، معرکہ آراء ہو چکا ہے؟
کیا بہار دنیا میں پھر آئے گی اور اس کے زخمی جسم پر اپنی سبز چادر ڈالے گی؟
کاش میں جانتا کہ کیا بہار اس دنیا میں پھر آئے گی؟



میرے اور تمہارے ملک کا انجام کیا ہوگا؟ اور وہ کونسی قبر مانی قوت ہے جو ان ٹیلوں اور پیٹروں پر ہاتھ رکھے گی، جنہوں نے ہمیں مرد اور عورت بنا کر، اس دنیا میں نمودار کیا!

کیا شام اسی طرح بھیریوں کے غاروں اور خزیروں کی باڑوں میں پڑا رہے گا یا ہم آندھیوں کے ساتھ شیر کے بند اور عقاب کے بلند مسکن کی طرف جائیں گے؟
کیا لبنان کی چوٹیوں پر صبح کا ستارہ طلوع ہوگا؟

جب کبھی مجھے تمہائی نصیب ہوتی ہے تو میں اپنے نفس سے یہ سوالات کرتا ہوں مگر نفس قضاء و قدر کی طرح دیکھتا ہے سب کچھ ہے بولتا نہیں۔ چلتا ضرور ہے، پلٹ کر نہیں دیکھتا، اس کی نگاہیں روشن ہیں اور قدم گرم رفتار، لیکن اس کی زبان جکڑی ہوئی ہے!

لوگو! تم میں کون ہے، جو شب درواز اپنے نفس سے یہ سوال نہیں کرتا کہ ”جب قبر مانی قوتیں“ اپنے چہروں پر بیواؤں اور یتیموں کے آنسوؤں کی نقاب ڈال لیں گے تو اس وقت دنیا اور دنیا والوں کا حشر کیا ہوگا؟“

میں نشو و ارتقاء کی سنت کا قائل ہوں اور میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ سنت جو دظاہری کے ساتھ وجود معنوی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے چنانچہ جب مخلوق مناسب سے مناسب تر کی منزل میں آتی ہے تو مذہب اور حکومت بھی خوب سے خوب تر ہو جاتے ہیں اور اس بنیاد پر اس سنت کی رجعت بھی ظاہری ہے اور انحطاط بھی سطحی۔

سنت ارتقاء کی بہت سی راہیں ہیں، جو با اعتبار فرغ ایک دوسرے سے مختلف تہی، لیکن با اعتبار اصل ایک ہیں۔ اس کا ظاہری پہلو بہت بے رحم اور تاریک ہے، جس سے محدود عقلیں انکار کرتی ہیں، اور کمزور دل بغاوت، لیکن اس کا باطنی پہلو عادل اور روشن ہے، اس حق سے چمٹا ہوا ہے، جو افراد کے حقوق سے بلند ہے۔ اس غرض پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے جو جماعت کی اغراض سے اعلیٰ ہے، اس آواز پر کان لگائے ہوئے ہے، جو غم زدوں کی آہوں اور غمگینوں کی سبکیوں کو اپنے خوف اور شیرینی میں جذب کر لیتی ہے۔

میرے گرد و پیش، ہر جگہ وہ بونے ہیں جو دور سے جنگ آزما قبر مانی قوتوں پر چھائیوں کی پرچھائیاں دیکھتے ہیں سوتے ہیں ان کے نعرہ ہائے مسرت کی صدائے بازگشت سنتے ہیں اور مینڈکوں کی طرح چلاتے ہیں۔

”دنیا اپنی ابتدائی فطرت کی طرف لوٹ گئی۔ قوموں نے اپنے علم و فن کی مدد سے جو کچھ بنایا تھا، اسے وحشی انسان کی حرص و امانیت نے ڈھا دیا، چنانچہ آج ہمارا وہی حال ہے جو غاروں میں رہنے والے انسان کا تھا۔ آج اگر ہمیں ان سے کوئی چیز ممتاز کرتی ہے تو یہ وہی آلات ہیں جو ہم نے تباہی کے لئے ایجاد کئے ہیں یا پھر وہ حکمت و تدبیر جسے ہم ہلاکت کے لئے کام میں لاتے ہیں۔“

یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں جو عالم کے ضمیر کو اپنے ضمیروں کی ترازو میں تولتے ہیں اور ہستی کی غایت کے تجزیہ کے لئے اس کوتاہ عقل سے کام لیتے ہیں جسے وہ اپنے وجود شخصی کی حفاظت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ گویا آفتاب صرف اس لئے ہے کہ انہیں حرارت پہنچائے اور سمندر صرف اس لئے کہ وہ اس میں اپنے پاؤں دھوئیں۔



زندگی کے سینے سے، محسوسات کے پیچھے سے، نظام ہستی کی گہرائیوں سے، جہاں اسرار وجود پوشیدہ ہیں، قہرمانی قوتیں ہوا کی طرح ابھیریں، بادلوں کی طرح بلند ہوںیں اور پہاڑوں کی طرح آپس میں مل گئیں۔ اب وہ برسرِ پیکار ہیں، دنیا کی ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے جو تباہی و بربادی کے بغیر کبھی حل نہیں ہو سکتیں۔

لیکن انسان، اس کے علوم و فنون اس کی محبت و نفرت اور اس کا صبر و اضطراب اور درد بے چینی۔ یہ سب وہ آلات ہیں جنہیں قہرمانی قوتیں، اس مقصدِ اعلیٰ کو حاصل کرنے کا ذریعہ بناتی ہیں جس تک پہنچنا ضروری ہے۔

رہا وہ خون جو بہایا گیا سو وہ کوثر کونہریں بن کر بھولے گا، رہے وہ آنسو جو بکھیرے گئے، سو وہ خوشبودار پھول بن کر اگیں گے۔ رہیں وہ جانیں جو ضائع کی گئیں سو وہ ایک جگہ جمع ہو کر نئی صبح کی شکل میں نئے افق سے طلوع ہوں گی اور اس وقت انسان کو معلوم ہوگا کہ اس نے حق کو ابتلاء کہ بازار سے خریدا ہے۔ ہاں! وہ سمجھ لے گا کہ حق کی راہ میں خرچ کرنے والا کبھی گھٹے میں نہیں رہتا!

لیکن بہار؟..... بہار ضرور آئے گی! مگر جو کوئی اس کا تحفہ سرائی ہاتھوں سے لینے پر تیار نہ ہوگا وہ ہمیشہ اس سے محروم رہے گا!!



فلسفہ دہشت

سیاہ رات مسلط برسر کائنات ہو چکی۔ تیز جھونکے اونچے اونچے درختوں سے دیوانوں کی طرح ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ ہر چہار برف اک گہری گہری خاموشی ہے اور موت کا سناٹا۔

ایسے وقت میں ایک غیر مبہم دہشت مجھ پر طاری ہے دل پریشان پریشان ہے اور خیالات خیابان چکر کاٹتے ہوئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سرسراتے ہوئے جھونکوں میں ہزاروں بھوت برس پیکار ہیں۔ فضاؤں میں سیاہ فام چڑیلیں مصروف جدل ہیں اور رو کر ماحول کو وحشت ناک بنا رہی ہیں۔

جب تو پتے پتے پر خوف اور ذرے ذرے پر کپکپاہٹ طاری ہے۔

آہ! یہ نامعلوم سا کوف تو مجھ اور بھی متوحش کر رہا ہے۔ میرے کمزور دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ ترقی پذیر ہے۔

دور جھاڑی سے کوئی ننھا سا پرندہ چیخ پڑا۔ اس کی غمگین راگنی! جیسے اداسی کی دیوی کوئی پرالم نوحہ پڑھ رہی ہو۔

کتے چلاتے تھک گئے۔ جھنگر شور مچا رہے ہیں اور الفیلسفہ کے کسی خاص نقطہ پر پہنچنے کے لئے سرگرم تحقیقات ہیں۔

میری روح قالب سے علیحدہ ہونے کو بیقرار ہے اور شدت دہشت سے جسم لرزہ بر اندام۔

لرزتے ہوئے سائے بل کھا رہے ہیں جیسے غیر مرئی وادیوں کی روئیں آنکھ مچولی میں مصروف ہوں۔ اونچے اونچے درخت اور پھیلی ہوئی جھاڑیاں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ جنات ہیولانی بھٹک رہے ہیں۔

خزاں کے دھندلے آسمان پر مدہم سا چاند چمک رہا تھا۔ اس نے بھی بادلوں کی

اوٹ میں منہ چھپالیا جیسے نیکی اور پاکیزگی کے فرشتے نے چہرے پر نقاب دلا لیا ہو۔ اہل دہر کی لغزشوں کی تاب نہ لا کر انگشت بدنداں ہو اور نیکیوں کو کانپ کانپ کر فضا میں تحلیل ہوتے دیکھ کر سکت۔

”مقدس معبود!“ میں غیر اختیاری طور پر پکار اٹھتا ہوں۔ مجھے اس روح فرسا ماحول سے بچا جہاں گناہوں کی سیاہی برسر و اج ہے اور اک پوشیدہ سا خوف ابھرتا ہے، دیتا ہے اور پھر تسلط کائنات کر لیتا ہے۔

”محافظ، حقیقی! مجھے اپنے پناہ میں لے لے انک علیٰ کلی شئی قدر میں تیری پر سطوت حفاظت میں آنا چاہتا ہوں۔ جہاں نور ہی نور ضو فشاں ہے اور قدسیت کا دور دورہ۔

جہاں کسی دہشت کا شائبہ تک نہیں اور نیکی گناہوں میں معدوم نہیں ہوتی۔



فلسفہ آزادی

موسم خزاں کے بلگے سے دھندلے آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں۔ دم بخود صورت بیمار! شعلہ ہائے آہ کو اشکوں سے بجھانے میں مجھ جیسے اس قوم کی چپارگی پر از خود رمیدہ ہوں جس کا حق آزادی غلامی کی قابل نفرت ساحرہ نے سلب کر لیا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان آسمانی درپچوں سے کبھی آزادی کو حسین دیوی بھی جھانک لے۔ ان الم رسیدہ اور گرفتار نفس انسانوں کو اپنی جھلک دکھا دے۔ جس کے برابطہ ہائے ہستی کے تار حسرتوں نے توڑ دیئے۔ جن کی روحیں غلامی کے بوجھ سے دبی جا رہی ہیں اور دل اس قابل نفرت احساس کی تاب نہ لا کر چور چور ہیں۔ جب ہر تار یک بادل کے پیچھے چمکتا ہوا سورج موجود ہے تو یہ شب دیبجور کی سی سیاہی کب تک؟

اور یہ فضاؤں میں معلق درد میں ڈوبی ہوئی پکار؟... جیسے رباب کے تار توٹ کر اس نغموں کو جھنجھنا دیتے ہیں۔

افتح کی گہرائیوں سے سپید اہ سحر نمودار ہو گیا۔ پیام حیات نولانے والا سپیدہ! اب ابر آلود آسمان ظلمت کے بادلوں سے چھٹکارا پائے گا۔ غلامی کے خوفناک پنچے کی ہمہ گزند ڈھیلی پڑ جائے گی اور! اور!! جب وطن کا جذبہ ذوق آزادی تک بڑھ جائے گا۔

پہلی شعاع آفتاب نے کائنات کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا۔ مرغان چمن نشیلے اور روح پرور گیت گارہے ہیں۔ ہر شے تازہ دم ہے اور فرج مسرت سے گننار۔ مقدس، معبود! یہ شعاع آزادی تو نہیں!!
یہ پہلی شعاع آفتاب۔!!!



فلسفہ ناکامی

کسی مصیبت زدہ کہانی سے بڑھ کر کون سا قصہ دلگداز ہے۔ ماجرائے بلا کشاں! جس کا فقرہ فقرہ پر تاثر ہے اور ایک ایک جملہ افسردگیاں چھپائے ہوئے۔ لیکن یہ اس مسافر کی حالت سے زیادہ اندوہ گین نہیں جو دشت و صحرا کے سفر سے تھک کر چور چور ہو چکا ہو اور نو کیلے کانٹوں سے آبلہ پا منزل مقصود کے سامنے پہنچ چکا ہو لیکن انچ بھر بھی آگے بڑھنے کے ناقابل! نگاہیاس سے تکتا رہے لیکن نہ اتنی ہمت رہی ہو اور نہ اس قدر سکت۔

اللہ! کیسا ناکام ہے وہ بد نصیب! جو وطن میں بھی مسافر ہو کر رہ جائے۔ جس منزل کے حصول کے لئے نہ دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات۔ اس کے سامنے ہو لیکن پھر بھی اس سے دور۔

اس انسان سے زیادہ دل شکستہ کون ہوگا جس نے اپنی آرزوؤں کے غنچے کو خون سے سینچا ہو۔ اس کے بڑھنے کا ایک ایک لمحہ گن رہا ہو۔ لیکن ہوا کا ایک ہی جھونکا اسے گرا دے۔ ٹہنی سے الگ کر دے اور اس کی پگھڑیوں کو منتشر۔

منزل مقصود کی قدر اس سے پوچھو! جس کی ابھرتی ہوئی آرزو دفن ہو کر رہ گئی ہو اور دنیائے امید ملیا میٹ۔

یا پھر وہ دم واپس مسافر! جو حیات کی ہر بازی میں ہارتا آیا ہو جس کی تقدیر کا پانسہ ہر بار سمت مخالف میں گرتا رہا ہو لیکن اب جبکہ باب قبول کے واہونے کا وقت ہے اور کشاکش حیات سے پینے کا لمحہ! تو فرشتہ موت بھی اپنی آمد آمد کا اعلان کر رہا ہے۔

اس غریب کے دلو لے دل ہی میں رہ جائیں گے منزل مقصود پر پہنچ کر بھی کھودینے کا صدمہ کیا کم ہے اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔



فلسفہ انتظار

دل گرفتہ بادلو! تم اس قدر بے قرار کیوں ہو رہے ہو۔ آہستہ آہستہ خرامی کی جگہ تیز روی نے لے لیے اور چوخیوں پر حسرتیں چھا رہی ہیں۔ گردش گردوں باعث انتشار ہے یا نیلگوں گہرائیوں میں کوئی چیز کھو گئی ہے۔

یہ موسم سرما کے سمندر کی تیز اور فناختہ جیسی سبک رفتاری کیوں؟

دن بھر کے رفیق آفتاب کی فرقت تو بیتاب نہیں کر رہی یا اسے لحد مغرب میں اترتا دیکھ کر یوں ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ آفتاب کے ساتھ ساتھ تمہاری زندہ دلی کیوں دفن ہو کر رہ گئی؟

بیقرار بادلو! انظم کائنات تو یہ ہے کہ جرعات تلخ سے لبریز جام کولیوں تک لاؤ لیکن ہمت و بہادری کے ساتھ۔ عناصر قدرت کی تیکھی چتون کا جو امر دیس مقابلہ کرو اور اپنی ہستی کو اس کی خوشنودی کے لئے منادو۔ جا دو اور کائنات کی وسعتوں میں خاکستر

نخنے نخنے حسین تارے تمام رات جگمگاتے ہیں بھٹکتے ہوئے مسافروں کے رہنما بن کر اور عروس شب کی ردائے عنبریں کی آرائش۔

لیکن جب وہ وقت آتا ہے جس کے انتظار میں ان کی پلک تک نہ جھپکتی تھی یعنی صبح رنگین لطف اندوزی کا تو پہلی شعاع آفتاب ہی احکام روپوشی صادر کر دیتی ہے۔ الہڑا اور شوریدہ موجیں اک عالم بیقراری میں بڑھتی ہیں۔ ساحل سمندر سے ملنے کو تمام مصائب پھانسی آتی ہیں۔ اللہ! اللہ!! بے نیازی ساحل!!! انہیں سر ٹکراتے دیکھ کر بھی متاثر نہیں ہوتا۔ انہیں پاش پاش ہوتے دیکھ کر ویسا ہی سگدل ہے بے پروا۔

الم رسیدہ بادلو! کائنات کا ہر نیا ورق ہی نمودار انقلاب ہے ورنہ لفظ ”کن“ کی تفسیر ہی کیونکر ثابت ہو۔ نغمہ حیات کی اضطرابی لئے تو ہر وقت فضاؤں میں منتشر رہتی ہے خواہ مد بھری جھجھنا ہٹ ہو یا نوحہ پرالم۔

لیکن جس طرح ہر تاریکی کے بعد رخشانی یقینی ہے اسی طرح کے بعد سکھ کا بھی وقت آتا ہے۔

یہ کرب و بے چینی! آخر کبھی تو ختم ہی ہوگی پھر وہی رفاقت رفیق ہوگی اور وہی دلچسپیاں۔

دامن افق سے مہر عالم تاب آخر تو جھانکنے گا ہی۔ دہر کو حیات بخشے کے لئے۔
اس وقت نیم جان بادلو! تمہاری کھوئی ہوئی طاقت بھی عود کر آئے گی۔ جس طرح
تشنہ زمین کو قطرات بارش از سر نو تازگی عطا کرتے ہیں۔

شب بھر ماہ عالم تاب گھلتا ہے تو دہر کو روشنی نصیب ہوتی ہے اگر شمع نہ جلے تو
پروانے کہاں سے آئیں؟ ہر شے کا کچھ آغاز ہی ہوتا ہے تو انجام پر بھی نگاہ کی جاتی
ہے۔

تمہاری یہ وارفتگی ہی دلیل حیات ہے اڑتی ہوئی ریت کی طرح پریشانی ہی طالب
کو مطلوب سے ملا دیتی ہے بھولی ہوئی منزل راہی کو تب ہی یاد آتی ہے جب نئی نئی
دلچسپیوں میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔

آشفۃ نوبادلو! اگر شب کے بعد سحر آسکتی ہے تو طلوع آفتاب بھی یقینی ہے اور نمود
کائنات کے لئے ضروری اس لئے اس قدر بیقراری بیکار ہے کہ دامن افق کو بھی
سرخ خون قلب سے لالہ زار بنا دیا جائے۔



فلسفہ حیات

رات کی ساعتیں شعلہ بدامن تھیں۔ فضا پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی جیسے غیر مرئی روحیں کج کج کی سیر کرتی پھر رہی ہوں۔

اس پرسکوت وقت میں محفل انجم گرم تھی۔ دھیمی دھیمی سرگوشیاں ہو رہی تھیں جو بڑھتے بڑھتے شوخ قہقہوں میں تبدیل ہو جاتیں۔

ایکاکی ایک ننھے سے شہاب ثاقب نے اپنی جگہ سے حرکت کی گویا کوئی نئی تحریک پیش کرنے لگا ہو۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اپنی کپکپاتی ہوئی دنیا سے نیچے کی طرف گرا اور فضاؤں کو چیرتا ہوا غائب از نظر ہو گیا جیسے اندھیرے کے سینے پر نشتر چل پڑا ہو۔ اب اس کی ضو فشرافیہ مفقود تھی اور جملہ تابانی نہاں۔

جہاں فانی میں ہماری مثال بھی شہاب ثاقب سے کم نہیں۔ آسمان حیات پر ہستی کا نور جگمگا تا رہتا ہے بڑھتی ہوئی شہرت اسے تاباں کر دیتی ہے اور معصومیت حد مکان تک درختاں۔

لیکن جب فرشتہ موت کا بلاوا آتا ہے تو اس لطیف نور کو خیر باد کہنا پڑتا ہے اور جملہ دلچسپیوں کو الوداع۔

ہستی قبر کی گہرائیوں میں پنہاں ہو جاتی ہے جیسے کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹے اور زمین پر پہنچتا پہنچتا فضا میں گھل کر رہ جائے..... اس کے باوجود لوگ زندگی کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں اور قدرت کا سب سے بڑا کارنامہ۔

حکایات جبران

خدا

زمانہ قدیم میں جب میرے ہونٹ پہلی بار گفتگو کے لئے جنبش میں آئے تو میں نے مقدس پہاڑ پر چڑھ کر خدا سے کہا۔

”اے میرے مالک! میں تیرا غلام ہوں تیری مشیت میرے لئے ایک قانون کا حکم رکھتی ہے اور میں تیرے احکام پر ہمیشہ کار بند رہوں گا۔“

لیکن خدا نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک تند طوفان کی مانند تیزی سے گزر گیا۔ ایک ہزار سال کے بعد میں پھر مقدس پہاڑ پر چڑھ کر خدا سے ان الفاظ میں گویا ہوا۔

”اے میرے خالق میں تیری مخلوق ہوں تو نے مجھے ان سے پیدا کیا اور میں نے اپنا سب کچھ تجھ ہی سے حاصل کیا ہے اور میرا سب کچھ تیرے ہی لئے ہے۔“

لیکن خدا نے کوئی جواب دیا اور ہزار ہا تیز پرندوں کی طرح سن سے گزر گیا۔ ہزار سال کے بعد پھر مقدس پہاڑ پر شہا اور خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اے باپ..... میں تیرا بیٹا ہوں تو نے مجھے شفقت اور محبت سے پیدا کیا اور میں محبت اور عبادت ہی سے تیری بادشاہت حاصل کروں گا.....“

لیکن خدا نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک ایسی کہر کی مانند جو دور دراز پہاڑیوں پر چھائی رہتی ہے۔ استغنا سے گزر گیا۔

ایک ہزار سال بعد میں پھر مقدس پہاڑ پر چڑھا اور ایک بار پھر خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرے خدا..... میرے مقصود اور میرے منہائے تکمیل، میں تیرا ماضی ہوں اور تو میرا مستقبل، میں زمین پر تیری اصل ہوں۔ اور تو آسمان پر میرا پھول..... ہم دونوں سورج کے سامنے نمودار ہوتے ہیں.....“

تب خدا مجھ پر جھکا اور میرے کانوں میں آہستہ سے چند میٹھی باتیں کیں پھر جس

طرح سمندر ایک ندی کو اپنی آغوش میں لپٹا لیتا ہے اسی طرح خدا نے مجھے اپنی
آغوش میں لے لیا۔

اور جب میں وادیوں اور میدانوں میں اترتا تو میں نے خدا کو اہاں بھی مود

پایا.....



دوست

میرے دوست! میں وہ نہیں ہوں جو میں دکھائی دیتا ہوں۔ میرا ظاہر تو صرف ایک لباس ہے، ہاں فکر و الم سے بنا ہوا ایک لباس جو مجھے تیرے سوالوں سے محفوظ رکھتا ہے اور تجھے میرے بے اعتنائی کا گلہ مند نہیں ہونے دیتا۔

میرا من خاموشی کے پردوں میں مستور ہے اور ہمیشہ وہیں مستور رہے گا کوئی اسے دیکھ نہ پائے گا کوئی اس تک نہ پہنچے گا۔

میرے دوست!

جب تو کہتا ہے ”ہوا کا رخ مشرق کو ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ”ہاں ہوا کا رخ مشرق کو ہے کیونکہ میں تجھے یہ نہیں بتانا چاہتا کہ اس وقت میرے دل میں ہوا کی بجائے سمندر کا خیال موجزن ہے۔ تو میرے متاطم خیالات کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ تو ان کی تہ تک پہنچے کیونکہ میں سمندر پر اکیلا ہی رہنا چاہتا ہوں۔

میرے دوست!

جب تیرے لئے دن ہوتا ہے تو میرے لیے رات ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں اس وقت دوپہر کی ان سنہری کرنوں کی باتیں کرتا ہوں جو پہاڑ پر قس کرتی ہیں اور اس ارغوانی سائے کی باتیں کرتا ہوں جو وادی پر آہستہ آہستہ چھا جاتا ہے کیونکہ تو میری تاریکیوں کے گیت نہیں سن سکتا اور نہ ستاروں کے پاس میرے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ سکتا ہے اور میرا بھی یہی دل چاہتا ہے کہ تو میرے گیتوں کو نہ سن سکے اور نہ میرے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ سکے کیونکہ میں رات کی تنہائی میں اکیلا ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔

میرے دوست!

جب تو اپنی بہشت کی طرف پرواز کرتا ہے تو میں اپنے دوزخ کی گہرائیوں میں اتر

جاتا ہوں۔ اس وقت بھی تو مجھے ایک ناقابل عبور خلیج کے پار سے پکارتا ہے میرے ہمد! میرے رفیق! تو میں تجھے میرے رفیق میرے ہمد کہہ کر جواب دیتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تو میرے دوزخ کو دیکھے، کیونکہ اس کے شعلے تیرے پینائی کو سلب کر دیں گے اور اس کا دھواں تیری سانس کو روک دے گا۔

مجھے اپنے دوزخ سے اتنی محبت ہے اور میں بھی تیری خاطر یہی کہتا ہوں کہ ان چیزوں سے محبت کرنا بجا اور مستحسن ہے لیکن میں دل میں تیری اس محبت پر ہنستا ہوں اس کے باوجود میں نہیں چاہتا کہ تو میری ہنسی کو دیکھے، کیونکہ میں ہنسنے کے لئے بھی علیحدگی پسند کرتا ہوں۔

میرے دوست!

تو نیک محتاط اور جہاندیدہ ہے میں جانتا ہوں کہ تو ہر بات میں یگانہ ہے میرے دوست!.... اس لئے میں بھی تجھ سے سوچ سمجھ کر باتیں کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میں ایک دیوانہ ہوں، اور اپنی دیوانگی کو چھپائے رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں اپنی دیوانگی سے علیحدہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ میرے دوست!

تو فی الحقیقت میرا دوست نہیں ہے میرے دوست.... لیکن میں تجھے یہ کیسے سمجھاؤں کہ میرا راستہ تیرے راستے سے مختلف ہے پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اکٹھے چل رہے ہیں۔



کاٹھ کا پتلا

ایک دن میں نے کھیتوں کے کاٹھ کے پتلے سے کہا..... تم اس کھیت میں کھڑے اکتا گئے ہو گے.....

اس نے کہا..... ”جانوروں کو ڈرانے کی لذت اس قدر عمیق اور دیرپا ہے کہ میں اس سے کبھی انہیں اکتاتا.....“

میں نے ایک منٹ سوچ کر کہا..... ”یہ سچ ہے کیونکہ میں نے بھی اس مسرت کا مزہ چکھا ہے“ اس نے کہا..... ہاں وہی لوگ جن کے جسم میں گھاس پھوس بھری ہو اس لذت سے آشنا ہو سکتے ہیں.....“

یہ سن کر میں وہاں سے چل دیا لیکن مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نے میری تعریف کی یا میرا مضحکہ اڑایا۔

ایک برس گزر گیا اور اس مدت میں وہ کاٹھ کا پتلا ایک فلاسفر بن چکا تھا۔ اور جب میں دوبارہ اس کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر دو کوؤں نے گھونسل بنا رکھا ہے۔



دو عورتیں

میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اس میں ایک عورت اور اس کی بیٹی رہتی تھی۔ یہ دونوں مرض کا بوس میں مبتلا تھیں۔

ایک رات جب ساری دنیا پر خاموشی طاری تھی مجھے ماں اور بیٹی نیند کی حالت میں چلتی ہوئیں اپنے باغ میں ملیں جس پر کھرٹھائی ہوئی تھی۔

ماں نے بیٹی سے کہا..... ہوں مجھے پتہ چل گیا میری دشمن تو ہے جس نے میری جوانی برباد کر دی، ہاں تو جس نے میری زندگی کے کھنڈرات پر اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔ اے کاش! میں تجھے ہلاک کر سکتی۔“

بیٹی نے کہا..... ”اے قابل نفرت اور خود غرض بڑھیا، تو جو میرے اور میری آزاد فطرت کے درمیان حائل ہے اور جو میری زندگی کو اپنی پڑ مردہ زندگی کا ہم رنگ بنا نا چاہتی ہے۔“

اے کاش خدا تجھے موت نصیب کرے.....

اس وقت ایک مرغ نے اذان دی اور دونوں عورتیں بیدار ہوئیں بڑھیا نے نہایت شفقت سے کہا..... ”کیا یہ تم ہو میری لخت جگر.....“

اور لڑکی نے بڑے پیارے سے جواب دیا..... ”ہاں امی جان.....“



عقل مند

ایک دن ایک عقلمند کتے نے بلیوں کی ایک جماعت دیکھ۔ جب وہ ان کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھ، کہ بلیاں اپنے آپ میں مست ہیں اور اس طرف متوجہ نہیں اس لئے وہ ان کی باتیں سننے کے لئے رک گیا۔ پھر ان میں سے ایک موٹی تازی اور سنجیدہ بلی اٹھی اور سب پر گہر نظر ڈال کر کہا۔

”بہنو۔ خدا سے دعا مانگو کیونکہ جب تم پورے یقین کے ساتھ بار بار دعا مانگو گی، تو آسمان سے سچ مچ چوہوں کی بارش ہوگی۔“

جب کتے نے یہ بات سنی تو وہ اپنی دل میں ہنسا اور ان سے منہ موڑ کر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

”اری اندھی اور بیوقوف بلیو! کیا یہ کتابوں میں نہیں لکھا اور خود تمہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کو یہ معلوم نہیں، کہ جب خدا کی عبادت کرنے اور دعائیں مانگنے سے بارش ہوتی ہے تو آسمان سے چوہوں کی بجائے ہڈیاں برستی ہیں.....“



لین دین

ایک شخص کے پاس اس قدر سوئیاں تھیں۔ کہ ان سے ایک وادی پر ہو سکتی تھی۔

ایک دن مریم اس کے پاس آئی اور کہا ”بھائی میرے بیٹے کا لباس پھٹ گیا ہے
قبل اس کے کہ وہ بیگل میں جائے میں اس کا لباس مرمت کرنا چاہتی ہوں کیا تم
مجھے ایک سوئی عنایت کر سکتے ہو.....؟“

اس نے مریم کو سوئی نہ دی لیکن لین دین کے متعلق ایک عالمانہ لیکچر دے کر کہا کہ
جب تمہارا بیٹا بیگل کو جانے لگے تو اسے میرا یہ وعظ سنا دینا۔

(1) مسیح کی والدہ



آپ بیتی

تم پوچھتے ہو کہ میں پاگل کیسے بنا؟ یہ واقع یوں رونما ہوا۔ ایک دن جب کہ بہت سے دیوتا ابھی پیدا نہ ہوئے تھے میں گہری نیند سے بیدار ہوا اور دیکھ کہ میرے تمام نقاب، ہاں وہ سات نقاب چوری ہو گئے ہیں جو میں نے اپنی سات زندگیوں میں بنائے اور پہنے۔ میں لوگوں سے بھری ہوئی گلیوں میں بے نقاب ”چور چور، ملعون چور، پکارتا ہوا دورا، مردوں اور عورتوں نے مجھ پر تھپتھپے لگائے اور بعض میرے ڈر سے اپنے گھروں میں جا چھپے۔

جب میں بازار میں پہنچا تو ایک نوجواب نے جو مکان کی چھت پر کھڑا تھا چلا کر کہا ”یہ دیوانہ ہے دیوانہ“ میں نے اسے دیکھنے کے لئے اوہر کی طرف نظریں اٹھائیں تو سورج نے پہلی بار میرے برہنہ چہرے کو چوما۔

میری روح سورج کی محبت سے تمتنا اٹھی اور مجھے اپنے نقابوں کی کوئی ضرورت نہ رہی اور میں بے اختیار چلا اٹھا۔

”رحمت..... ہاں رحمت ہواں لوگوں پر جنہوں نے میرے نقاب چرائے۔“
اس طرح میں دیوانہ بن گیا۔

اسی دیوانہ پن میں مجھے آزادی اور سلامتی حاصل ہوئی!!
آزادی اس لئے کہ اب میں اکیلا ہوں۔

سلامتی پر مغرور نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جیل خانہ میں بند ایک چور دوسرے چور سے محفوظ ہوتا ہے۔



دیوانگی و فرزانگی

ایک دن ایک شخص مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور کہا

”میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے.....“ میں نے کہا

اس نے کہا ”ایک دیوانہ ایسی باتیں کیسے کر سکتا ہے؟“

”آپ کا مطلب؟“

”دیوانگی سے فرزانگی کا تعلق؟“

”دنیا میں کتنے فرزانے ہیں جو فرزانے نہیں اور کتنے دیوانے ہیں جو دیوانے

نہیں.....

”دیوانہ بہر حال دیوانہ ہے“

”بجا، لیکن سب دیوانے ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ

کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

اس کے علاوہ پیر ہندی نے کہا ہے

کہہ جاتا ہوں میں زور جنوں میں ترے اسرار

مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفۃ سری کا

اور

ستم ہے خوار پھرے دشت دور میں

زجاج گر کی مکاں شاعری و ملانی

دیوانہ

کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ

کسے خبر کے جنوں میں کمال اور بھی ہیں

کہ اس کے واسے لازم نہیں ہے ویرانہ

ہجوم مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو

پھر ساتھ ہی یہ خواہش بھی ظاہر کی ہے کہ

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرہ لا تخر
خرد کی گتھیاں سلجا چکا میں
مرے مولا! مجھے صاحب جنوں کر
اب فرمائیے آپ کیا جانا چاہتے ہیں؟
وہ دیر تک ایک گہری سوچ میں پڑا رہا اور پھر چلا گیا۔

☆☆☆☆

All rights reserved.

©2002-2006

پریم گیت

ایک دفعہ ایک شاعر نے محبت کا ایک گیت لکھا

بڑا ہی پیارا گیت!

اس نے اس گیت کے بہت سے نسخے تیار کرائے اور انہیں اپنے دوستوں اور اپنی جان پہچان والوں کو..... مردوں اور عورتوں کو بھجوایا اور اس نوخیز دوشیزہ کو بھی، جسے آج تک وہ صرف ایک ہی بار ملا تھا۔ جو اونچے پہاڑوں کے دوسری جانب رہتی تھی! اس کے کچھ دن بعد اس نے نوخیز دوشیزہ کا قاصد اس کا خط لے کر شاعر کے پاس آیا، خط میں اس نے لکھا تھا۔

”میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ محبت کے اس گیت نے جو تم نے مجھے لکھ کر بھیجا۔ مجھے بے حد متاثر کیا ہے..... تم اب میرے یہاں آؤ ایک بار میرے ماں باپ سے ملو، اور پھر ہم یقیناً اپنی نسبت کی بات چیت کئی کر لینے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی لیں گے!“

شاعر نے اس خط کا جواب اسے یوں لکھ بھیجا..... خاتون یہ تو صرف محبت کا ایک گیت تھا۔ شاعر کے دل سے نکلی ہوئی بات..... وہ گیت، جو مرد، عورت کے لئے گاتا ہے، اس کے جواب میں اس دوشیزہ نے لکھا۔

”مکار..... فریبی آج سے اپنی موت کے دن تک، جب تک بھی کہ میں اندہ ہوں، صرف تیری وجہ سے کسی شاعر کو منہ نہ لگاؤں گی..... میں شاعروں سے ہمیشہ ہی نفرت کرتی رہوں گی!“



میلے میں

کسی دیہات سے ایک خوبصورت لڑکی ایک میلے میں آئی..... کہتے ہیں بڑی ہی حسین تھی وہ دوشیزہ!

اس کے چہرے پر سون اور گلاب کی سی تازگی تھی۔ بالوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں کی جھلملاہٹ تھی۔

اور ہونٹوں پر طلوع صبح کی مسکراہٹ!

جیسے ہی میلے میں، یہ حسین اجنبی دوشیزہ دکھائی دے، جوانوں کی بھیڑ نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا..... ایک اس کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ تو دوسرا اس کے اعزاز میں شراب کے خم اندھا رہا تھا۔ اور اس کے گلابی گال چومنے کی ہوس میں تو سبھی بے تاب ہو رہے تھے۔

آخر وہ بھی تو میلے ہی میں آئے ہوئے تھے نا

لیکن حسین دوشیزہ پریشان تھی گھبرا رہی تھی، جوانوں کی بھیڑ میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا، اسے ان سے وحشت ہو رہی تھی وہ انہیں کوسنے دے رہی تھی..... اور ایک کے تو اس نے تھپڑ بھی جڑ دیا تھا..... آخر وہ ان سے بھاگ کر دوڑ چلی گئی!

”اف تو بہ ہے، ناک میں دم کر دیا“ اس شام گاؤں لوٹے ہوئے، راستے میں وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”کس قدر ناشائستہ اور بدتمیز ہیں، یہ نو جوان..... نا قابل برداشت ہیں بابا یہ سب لوگ! ایک سال گزر گیا۔ اور وہ حسین دوشیزہ سال بھر میلے اور نو جوانوں کی یاد میں ڈوبی رہی میلے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں کی جھلملاہٹ اور ہونٹوں پر طلوع صبح کی مسکراہٹ لئے میلے میں آئی! لیکن اب جو جوان بھی اسے دیکھتا، منہ پھیر لیا..... سارا دن گزر گیا نہ کسی نے اسے بلایا نہ کسی نے اس سے بات کی..... وہ تنہا ہی میلے میں پھرتی رہی۔

اور اس بار رات گئے گاؤں لوٹتے ہوئے، وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔
”ہائے تو بہ ”ناک میں دم ہے کس قدر بد اخلاق اور بد اطوار ہیں یہ نو
جوان..... نا قابل برداشت ہیں بابا یہ سب لوگ!“

☆☆☆☆



ازدواجی زندگیاں

شواکس شہر میں ایک شہزادہ رہتا تھا.... سبھی اس سے پیار کرتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے، یہاں تک کہ چراگا ہوں سے چوپائے تک اس کے سلام کو آتے تھے! لیکن عوام کا خیال یہ تھا کہ اس کی بیگم، بادشاہ زادی کو اس سے بالکل پیار نہیں..... شاید وہ اس سے نفرت کرتی تھی!

ایک دن پڑوس کی کسی ریاست سے ایک شہزادی شواکس کی شہزادی سے ملنے آئی وہ دیر تک ایک ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔

باتوں ہی باتوں میں ان کے شہزادی جذباتی ہیجان میں آ کر بولی۔

”مجھے تو تمہاری ازدواجی زندگی پر رشک آتا ہے۔ تمہاری! تمہارے شہزادے کے ساتھ خوشی پر، حالانکہ میرے بیاہ کو بھی کافی مدت بیت چکی ہے.... مگر سچ پوچھو تو مجھے اپنے خاوند سے نفرت ہے وہ کوئی صرف میرا تھوڑے ہی ہے مجھ ایسی بد نصیب عورت شاید ہی دنیا میں کوئی ہو!“

تب مہمان شہزادی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے پوچھتی ہو تو حقیقتاً صرف تم ہی اپنے خاوند سے سچی محبت کرتی ہو کیونکہ تمہارے سینے میں ابھی تشنہ آرزوئیں موجود ہیں.... وہ آرزوئیں جن سے عورت کا نکھار قائم رہتا ہے بالکل اس طرح جس طرح پھولوں سے چمن کی بہار.... لیکن قابل رحم ہے حالت میری اور میرے خاوند کی کہ ہم صبر شکر کر کے ایک دوسرے کو برداشت کئے جا رہے ہیں۔ صرف نبہ کئے جا رہے ہیں اور اس زندگی پر تمہیں اور دوسرے لوگوں کو غلط فہمی ہے قابل رشک خوشی اور مسرت کی!“



نشاط نو

کل رات میں نے ایک نئی قسم کی مسرت دریافت کی اور جب میں نے اس کا پہلی بار مزا چکھا۔

تو نیکی اور بدی کے فرشتے میرے گھر کی طرف دوڑے وہ میرے مکان کے دروازے پر ایک دوسرے سے ملے اور میری نئی مسرت کے متعلق جھگڑنا شروع کر دیا۔

”ایک نے کہا یہ گناہ ہے۔“

دوسرے نے کہا ”نہیں، یہ نیکی ہے۔“



دوسری زبان

اپنی پیدائش کے تین دن بعد جب میں ریشمی پنگوڑے میں پڑا اپنی اردگرد کی دنیا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا تو میری والدہ نے انا سے پوچھا۔ ”کیسا ہے میرا لال؟“ انا نے جواب دیا۔ ”بیگم بچہ بہت اچھا ہے میں نے اسے تین بار دودھ بلایا ہے میں نے آج تک ایسا بچہ نہیں دیکھا جو اتنا خوش ہو۔“

میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا۔ ”ماں یہ سچ نہیں..... کیونکہ میرا کچھونا سخت ہے اور میں نے جو دودھ پیا ہے وہ میرے منہ کو کڑوا لگا ہے اور چھاتی کی بدبو میرے لئے ایک عذابِ عظیم ہے میں بہت تکلیف میں ہوں ماں.....“

لیکن میری بات نہ میری ماں سمجھ سکی نہ میری انا۔ کیونکہ میں جس زبان میں بول رہا تھا وہ اس دنیا کی زبان نہ تھی بلکہ اس دنیا کی زبان تھی جہاں سے میں آیا تھا۔

اکیسویں دن ہمارے ہاں ایک کاہن آیا اور اس نے میری ماں سے کہا..... ”تمہیں خوش ہو چاہئے کیونکہ تمہارا بیٹا پیدائشی مومن ہے.....“

مجھے حیرت ہوئی، اور میں نے کاہن سے کہا۔ ”پھر تمہاری متوفی والدہ کو افسوس ہونا چاہئے کیونکہ تم ایک پیدائشی مومن نہ تھے.....“ لیکن کاہن بھی میری زبان نہ سمجھ سکا۔

سات مہینوں کے بعد ایک دن مجھے ایک منجم نے دیکھا اور میری ماں سے کہا۔

”تمہارا بیٹا بہت بڑا سیاست دان اور جلیل القدر رہنما ہوگا۔“

میں چیخ اٹھا کہ ”یہ غلط پیش گوئی ہے ماں کیونکہ میں ایک معنی کے سوا اور کچھ نہ بنوں گا.....“

لیکن اس عمر میں بھی میری زبان کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور مجھے سخت حیرت ہوئی۔

اور اب میری عمر تینتیس سال کی ہے اور میری ماں، میری انا اور کاہن سب مر چکے ہیں (خدا انہیں جنت نصیب کرے) لیکن وہ نجومی ابھی تک زندہ ہے اور کل مجھے

معبد کے دروازے کے قریب ملاجب ہم ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے تو اس نے کہا۔

”میں شروع ہی سے جانتا تھا کہ تم ایک معنی بنو گے اور میں نے تمہاری بچپن میں بھی یہی پیش گوئی کی تھی۔“

میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا، کیونکہ اب میں خود اپنی پہلی زبان بھول چکا ہوں۔



All rights reserved.

©2002-2006

انار کی کلی

ایک دفعہ جب میں انار کی کلی میں رہتا تھا تو میں نے ایک بیج کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ”کسی دن میں ایک درخت بن جاؤں گا۔ ہوا میری ٹہنیوں میں گیت گائے گی۔ سورج کی کرنیں میرے پتوں پر رقص کریں گی اور میں تمام موسموں میں خوبصورت اور طاقت ور ہوں۔“

پھر دوسرا بیج بولا ”جب میں تمہاری طرح جواں تھا تو میرے بھی یہی خیالات تھے لیکن اب جبکہ میں تمام چیزوں کا صحیح اندازہ کر سکتا ہوں، میں محسوس کرتا ہوں کہ میری تمام توقعات غلط ثابت ہوئی ہیں۔“

تیسرا بیج بولا۔۔۔۔۔ ”ہم میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے ہمارا مستقبل شاندار معلوم ہو۔۔۔“

چوتھے نے کہا۔ ”لیکن ایک شاندار مستقبل کے بغیر ہماری زندگی محض ایک سوانگ ہوگی۔“

پانچویں نے کہا۔ جب ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا ہیں، تو پھر اس بات پر بحث کرنے کیا کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم مستقبل میں کیا بنیں گے۔

چھٹے نے جواب دیا ”ہم جو کچھ ہیں وہی کچھ ہمیشہ رہیں گے۔“

ساتویں نے کہا۔ ”مجھے آنے والے واقعات کا پورا علم ہے لیکن میں انہیں الفاظ کے ذریعہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔۔۔۔۔“

اس کے بعد آٹھواں بولا۔ پھر نواں اور پھر دسواں۔ حتیٰ کہ تین بیج اس بحث میں کو دپڑے مجھے ان لاتعداد آوازوں میں کسی کی بات بھلی معلوم نہ ہوئی اس لئے میں نے اسی دن ایک شگونے کے دل میں جگہ بنالی جس میں بیج بھی تھوڑے ہیں اور زیادہ بات چیت بھی نہیں کرتے۔

دو پنجرے

میرے باپ کے باغ میں دو پنجرے ہیں۔

ایک میں وہ شیر قید ہے جسے میرے باپ کے غلام نینوا کے صحرا سے پکڑ کر لائے

تھے۔ دوسرے میں ایک چڑیا ہے جو گانے سے قاصر ہے۔

چڑیا ہر روز صبح کے وقت شیر سے کہتی ہے۔

”بھائی قیدی! صبح بخیر!!!“



تین چیونٹیاں

ایک آدمی دھوپ میں پڑا سو رہا تھا کہ تین چیونٹیاں اس کی ناک پر اکٹھی ہوئیں، اور اپنے قبیلے کے دستور کے مطابق سلام کرنے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے لگیں۔ پہلی چیونٹی نے کہا ”میں نے ان پہاڑوں اور وادیوں سے زیادہ پنجر جگہ اور کوئی نہیں دیکھی میں نے یہاں سارا دن خوراک کی تلاش کی ہے لیکن مجھے ایک دانہ بھی نہیں ملا۔“

دوسری چیونٹی نے کہا ”مجھے بھی کچھ نہیں ملا۔ گو میں نے تمام گوشے اور کونے دیکھ مارے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ نرم اور متحرک خطہ ہے جس کے متعلق ہماری قوم کے دانا کہتے ہیں کہ وہاں کچھ نہیں پیدا ہوتا۔“

اس کے بعد تیسری چیونٹی نے اپنا سراٹھایا اور کہا ”میری سہیلیوں! ہم اس وقت اس عظیم الجثہ چیونٹیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور زور سے ہنسیں، عین اس وقت آدمی نے حرکت کی اور اس نے سوتے میں اپنے ہاتھ ناک کو کھجایا اور تینوں چیونٹیاں پس کر رہ گئیں۔“



قبر کن

ایک دفعہ جب میں اپنے اجزائے نفس میں سے ایک دفن کر رہا تھا تو قبر کن میرے پاس آیا اور کہا.... ”جتنے بھی لوگ یہاں دفن کرنے کے لئے آتے ہیں ان میں سے صرف تمہیں پسند کرتا ہوں۔“

میں نے کہا..... ”مجھے یہ سن کر بہت مسرت ہوئی، لیکن آخر تم مجھے کیوں پسند کرتے ہو.....“

اس نے جواب جواب دیا۔ ”دوسرے لوگ روتے ہوئے آتے ہیں اور روتے ہوئے چلے جاتے ہیں مگر تم ہنستے ہوئے آتے ہو اور ہنستے ہوئے چلے جاتے ہو۔“



آنکھ

ایک دن آنکھ نے کہا..... ”میں ان واویلوں کے پرے نیلگوں دھند سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کو دیکھ رہی ہوں۔ کیا وہ خوبصورت نہیں.....“

کان نے سنا اور جھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا..... ”لیکن پہاڑ ہے کہاں مجھے تو اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔“

پھر ہاتھ نے کہا۔ میں اسے چھونے اور محسوس کرنے کی بیکار کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی پہاڑ نہیں ملتا۔“

ناک نے کہا ”یہاں کوئی پہاڑ نہیں کیونکہ میں اسے سونگھ نہیں سکتی۔ آنکھ نے اپنی توجہ دوسری طرف کر لی اور پھر تینوں آنکھوں کے حیرت انگیز تصورات پر بحث کرنے لگے۔

انہوں نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ کو ضرور کچھ جنون ہو گیا ہے۔“



جب میرا غم پیدا ہوا

جب میرا غم پیدا ہوا تو میں نے اسے بڑی محبت سے پالا اور اس کی بڑی احتیاط سے نگہداشت کی۔

میرا غم دوسری چیزوں کی طرح نشوونما کرتا تھا، خوبصورت اور بڑی بڑی عشقوں سے معمور ہونے لگا۔

میں اور میرا غم ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے محبت کرتے تھے کیونکہ غم بہت رحم دل تھا اور میرا دل بھی بہت نرم ہوا تھا۔

اور جب میں اور میرا غم باتیں کرتے تو ہمارے دن ہوا کے پروں پر اڑے جاتے اور ہماری راتیں خوابوں سے بھر پور ہو جاتیں۔ کیونکہ میرے غم کی زبان فصیح تھی.... اور میری زبان میرے غم کی ترجمانی میں بہت فصیح تھی اور جب میں اور میرا غم گاتے۔ تو ہمارے پڑوسی کھڑکیوں میں بیٹھ کر سنتے۔ کیونکہ ہمارے گیت سمندر کی طرح گہرے اور ہمارے نغمے عجیب و غریب یادداشتوں سے معمور ہوتے تھے۔

اور جب میں اور میرا غم اکٹھے چلتے تو لوگ ہمیں لطف و کرم کی نظر سے دیکھتے۔ اور آہستہ آہستہ ہمارے متعلق میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ہم پر شک کرتے تھے کیونکہ غم ایک گرانقدر چیز تھا.... اور میں اس پر فخر کرتا تھا لیکن میرا غم فانی چیزوں کی طرح مر گیا اور میں اس کا ماتم کرنے کے لئے تنہا رہ گیا۔

اب جب میں بولتا ہوں، تو میرے الفاظ کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔ اور جب میں گیت گاتا ہوں تو میرے پڑوسی اس پر کان نہیں دھرتے۔ اور جب میں کوچوں میں سرگرداں پھرتا ہوں تو کوئی میری طرف نہیں دیکھتا۔ اب مجھے صرف نیند کے عالم میں یہ رحم سے بھری ہوئی دوازیں سنائی دیتی ہیں کہ ”دیکھو یہ وہ شخص ہے جس کا غم فوت ہو چکا ہے۔“

جب میری مسرت پیدا ہوئی

جب میری مسرت پیدا ہوئی تو میں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ اور چھت پر کھڑا ہو کر پکارنے لگا آؤ..... میرے پڑوسیو آؤ..... اور دیکھو آج میرے گھر مسرت پیدا ہوئی ہے..... آؤ اور اس مسرت انگیز چیز کو دیکھ، جو سورج کی روشنی میں ہنس رہی ہے۔“

لیکن جب میرا کوئی پڑوسی بھی میری مسرت کو دیکھنے کے لئے نہ آیا تو مجھے بے حیرت ہوئی۔ سات دنوں تک میں ہر روز اپنی مسرت کا اظہار چھت پر کھڑے ہو کر بلتند آواز سے کرتا رہا لیکن کسی نے میری آواز نہ سنی۔

اس طرح میں اور میری مسرت اکیلے رہ گئے نہ کسی نے اس کی تلاش کی اور نہ اسے دیکھنے کے لئے آیا۔ اس وجہ سے میری مسرت پڑمردہ اور نڈھال ہو گئی۔ کیونکہ میرے سوانہ کسی اور دل نے اس کی دلجوئی کی اور نہ کسی دوسرے کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو چوما۔

آخر کار میری مسرت تنہائی کے باعث فنا ہو گئی۔

اور اب میں اپنے مرحوم غم کی یاد میں اپنی گزری ہوئی مسرت کو یاد میں اپنی گزری ہوئی مسرت کو یاد کرتا ہوں لیکن یہ یاد ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہے جو ہوا میں زیر لب کچھ کہتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔



کامل دنیا

اے گمشدہ روحوں کے خدا! تو جو خود دیوتاؤں میں کھویا ہوا ہے۔ میری آواز سن! ہاں ہم دیوانی اور آوارہ روحوں کی نگرانی کریں والی ہستی! میرے الفاظ پر توجہ فرما.....!

میں ایک کامل قوم میں رہتا ہوں..... میں جو ایک غیر مکمل ہستی ہوں..... میں انسانیت کے پریشان اور منتشر عناصر کا مجموعہ ہوں۔

میں ایک کامل دنیا میں رہتا ہوں۔ جس کے قوانین اور ضوابط مکمل ہیں اور جن کے تصورات ضبط تحریر میں آسکتے ہیں۔

اے خدا ان کی نیکیاں گئی ہوئی اور گناہ تلے ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ لاتعداد ایسی چیزیں جو شام کے دھند لکے میں گناہ اور ثواب سے ماورا ہیں شمار و درج کی جاتی ہیں۔

یہاں دن رات چال چلن کے موسمی تغیرات میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور انہیں خوب جانچ تول کر کڑے اصولوں کی زنجیر میں جکڑا جاتا ہے۔

کھانا..... پینا..... سونا اور اپنی عریانی کی پردہ پوشی کرنا..... کام کرنا..... کھیلنا..... گانا..... ناچنا اور گھڑیاں بجاتے ہی چپ چاپ سو جانا۔

صرف ایک مقررہ شدت کے ساتھ غور و فکر کرنا..... افق کے اس پار ایک خاص ستارہ کے طلوع ہونے پر غور و فکر کا سلسلہ بند کر دینا۔

ایک زیر لب تبسم کے ساتھ اپنے پڑوسی کو لٹ لینا۔

ہاتھ کو شان سے ہلا کر خیرات کرنا۔

کسی کی جان بوجھ کر تعریف کرنا۔

دوسروں پر انتہائی چالاکی سے الزام عائد کرنا۔

کسی شخص کی زندگی کو ایک ہی لفظ میں تباہ کر دینا..... اور جب دن بھر کا کام تمام ہو

جائے ت نہایت عیاری سے ہاتھ دھولینا۔

ایک مضبوط ارادی کے ساتھ محبت کرنا..... ہوشیاری سے کسی کو خوش کرنا..... بن
ٹھن کر خدا کی عبادت کرنا..... بڑے تپاک سے شیطان کے ساتھ اتحاد کرنا..... اور
پھر سب کچھ بھول جانا۔

سوچ سمجھ کر کسی چیز کی تمنا کرنا۔

خندہ پیشانی سے ملول ہونا اور پیالہ خالی کر دینا..... تاکہ اسے کل پھر بھر دیا جائے۔
اے خدا! یہ تمنا چیزیں پہلے ہی سے سوچی گئی ہیں..... بڑی احتیاط کے ساتھ پیدا کی
جاتی ہیں اور ان کی بڑے اہتمام کے ساتھ نگہداشت کی جاتی ہے۔

حکومت کے قوانین کی آرڈر میں ان کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ مختلف ذرائع سے پاسبانی
کی جاتی ہے اور آخر کار طے شدہ طریقے کے مطابق انہیں ذبح کر کے دفن کر دیا جاتا
ہے اور ان کی خاموش قبروں پر بھی جو انسانی دلوں میں جاگزیں ہوتی ہیں نشان
لگا دیئے جاتے ہیں۔

یہ ہے ہماری کائنات، ہماری متمدن دنیا، جو عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔
یہ ہے قدر مطلق کے باغ کا پختہ شمر اور اس کی بہترین تمنا! مگر اے خدا میں یہاں
کیوں ہوں؟

میں جو ناکام خواہشوں کا ناقص بیج ہوں۔

ایک آوارہ طوفان ہوں۔

ایک ٹوٹے پھوٹے سیارے کا ٹکڑا جو ہواؤں میں پریشان ہے اور جو نہ مشرق کو
تلاش کرتا ہے نہ مغرب کو۔

اے گمشدہ روحوں کے خدا! تو جو دیوتاؤں کے جہوم میں گم ہے، بتا میں یہاں کیوں
ہوں؟



آوارہ گرد

وہ مجھے ایک چوراہے پر مل گیا..... ایک اجنبی جس کے ہاتھ میں ایک عصا تھا، تن پر ایک چادر اور جس کا چہرے پناہ درد و کرب کا آئینہ!

ہماری اس ملاقات میں گرم جوشی تھی اور خلوص تھا۔ میں نے اس سے کہا

”میرے گھر تشریف لائے اور میری میزبانی قبول فرمائیے!“..... اور وہ آیا!

میری بیوی اور بچے ہمیں دروازے پر ہی مل گئے وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اس کی آمد پر باغ باغ ہو گئے!

پھر ہم سب ایک ساتھ کھانے پر بیٹھے ہم بہت خوش تھے اور وہ بہت مسرور تھا لیکن خاموش! اور اس کی پرسرا خاموشی ہماری فہم سے بالاتر تھی۔

کھانے کے بعد ہم آگ کے پاس جا بیٹھے..... اور میں اس سے اس کی سیاحتوں کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔

اس رات اور دوسرے دن، اس نے ہمیں بہت سی کہانیاں سنائیں..... لیکن جو کچھ کہ میں اب لکھنے جا رہا ہوں۔ یہ اس کے تلخی ایام کی پیداوار ہے۔ اگرچہ وہ خود بہت ہی مشفق تھا اور رحم دل بھی..... مگر یہ کہانیاں اور یہ فسانے ایک غبار ہیں اس کے صبر آزما اور کٹھن راستوں کا!

تین دن بعد جب وہ ہم سے رخصت ہوا تو ہم کہہ نہ سکتے تھے کہ ہم نے کسی مہمان کو خیر باد کہا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم میں سے کوئی باہر باغیچہ میں ہے اور اسے ابھی اندر آنا ہے!



سات عناصر

رات کی گہری خاموشی میں جب میں نیم بیداری کے عالم میں پڑا تھا میرے ساتھ عناصر ایک دوسرے کے ساتھ زیر لب یوں گفتگو کرنے لگے۔

پہلا عنصر

میں نے اس دیوانے کے ساتھ کتنے ہی سال بسر کئے ہیں اس عرصے میں میرا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ میں دن کو اس کا دردنازہ کروں اور رات کو اس کا دکھ نئے سرے سے پیدا کروں یہ روز کی مصیبت مجھ سے سہی نہیں جاتی اور اب میں بغاوت کرنے پر آمادہ ہوں.....

دوسرا عنصر

بھائی تمہاری حالت مجھ سے بہتر ہے میں اس دیوانے کی مسرتوں میں شریک ہوں، اس کی ہنسی کے ساتھ ہنستا ہوں، اس کی خوش بختی کے راگ الاپتا ہوں، اور مجھے اس کے رقصاں خیالات کے ساتھ بلا کی سرعت سے ناچنا پڑتا ہے تمہاری بجائے میں اپنی دکھ بھری زندگی کے خلاف بغاوت کروں گا۔

تیسرا عنصر

”اور مجھ کشتہ محبت کے متعلق تمہارا کیا ارشاد ہے، جو بیجانی جذبات اور عجیب و غریب خواہشات کا ایک بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔ نہیں یہ مجھ برگشتہ محبت کا کام ہے کہ میں اس دیوانے کے خلاف بغاوت کروں.....“

چوتھا عنصر

میں تم سب سے زیادہ تکلیف میں ہوں کیونکہ میرے ذمہ نفرت اور حقارت کے تباہ کن جذبات کے سوا اور کچھ نہیں، میں وہ برگشتہ قسمت طوفانی عنصر ہوں، جس کی پیدائش دوزخ کے تاریک غاروں میں ہوئی ہے اس دیوانے کی غلامی کے خلاف بغاوت کروں گا.....“

پانچواں عنصر

نہیں بغاوت کرنے والا عنصر میں ہوں۔ جو غور و فکر کا خوگر ہے اور ہر وقت سوچ بچار میں گم رہتا ہے مجھے اپنی بھوک اور پیاس دور کرنے کے لئے نئی نئی چیزوں کی دھن لگی رہتی ہے اور میں ہمیشہ ان موہوم اور نادیدہ اشیاء کی تلاش میں منہمک رہتا ہوں۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوئیں، ہاں یہ بغاوت کرنے والا عنصر میں ہوں تو نہیں.....“

چھٹا عنصر

میں عمل کا عنصر.... ایک قابل رحم مزدور جو تھکے ہوئے ہاتھوں اور امیدوں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنے دنوں کو سیما کی تصورات میں تبدیل کرتا ہوں۔ اور غیر محسوس اشیاء کو نئے اور دائمی پیکر عطا کرتا ہوں، یہ میں ہوں، جو اس دیوانے کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں تم سے سبقت لے جاؤں گا۔

ساتواں عنصر

کتنی عجیب بات ہے کہ تم اس دیوانے کے خلاف صرف اس لئے بغاوت کر رہے ہو۔ کہ تمہارا کام مقرر ہو چکا ہے کاش تمہاری طرح میرا کام بھی مقرر ہوتا۔ لیکن افسوس مجھے کوئی کام سپرڈ نہیں کیا گیا۔ میں ایک بے کار عنصر ہوں جب تم سب زندگی کی تخلیق میں مصروف ہوتے ہو۔ تو میں ایک بے نام و نشان جگہ میں خاموش بیٹھا رہتا ہوں۔ تاؤ بغاوت مجھ کرنی چاہئے یا تمہیں؟“

جب ساتویں عنصر نے یہ تقریر کی تو باقی چھ عنصروں نے اس کی طرف رحم سے بھری ہوئی نظر کے ساتھ دیکھا۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہا اور جوں جوں رات تاریک ہوتی گئی تمام عناصر ایک ایک کر کے تسلیم و اطاعت کی لذت سے سرشار ہو کر محو خواب ہو گئے۔ لیکن ساتواں عنصر اس خلاء پر نظر جمائے دیکھتا رہا۔ جو ایک پس منظر کے طور پر ہر چیز کے پیچھے موجود ہے۔

جنگ

ایک رات قصر شاہی میں ایک دعوت ہوئی۔ اس موقع پر ایک آدمی آیا اور اپنے آپ کو شہزادے کے حضور میں پیش کیا۔ تمام مہمان اس کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ باہر نکل آئی ہے اور خالی جگہ سے خون بہہ رہا ہے۔

شہزادے نے اس سے پوچھا ”کہ تم کیا واردات گزری؟“

اس نے جواب دیا۔

”عالی جاہ میں ایک پیشہ ور چور ہوں اور آج شب جب کہ چاند بھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں ساہوکار کی دوکان لوٹنے کے لئے گیا لیکن غلطی سے جلاہے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ جوں ہی میں کھڑکی سے کودا میرا سر جلاہے کے کمر گھے کے ساتھ ٹکرایا۔ اور میری آنکھ پھوٹ گئی۔“

اے شہزادے اب میں اس جلاہے کے معاملے میں اصراف چاہتا ہوں.....

یہ سن کر شہزادے نے جلاہے کو طلب کیا۔ اور یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اس کی ایک آنکھ نکال دی جائے۔

جلاہا بولا۔

”دُئل سبانی آپ کا یہ فیصلہ درست ہے کہ میری ایک آنکھ نکالی جانی چاہئے۔ لیکن میرے کام میں دونوں آنکھوں کی ضرورت ہے تاکہ میں اسے کہڑے کی دونوں اطراف دیکھ سکوں جسے میں بنتا ہوں..... میرے پڑوس میں ایک موچی ہے جس کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں اس کے پیشے میں ان دونوں کی کوئی ضرورت نہیں.....“

یہ سن کر شہزادے نے موچی کو طلب کیا وہ آیا اور اس کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ نکال دی گئی۔

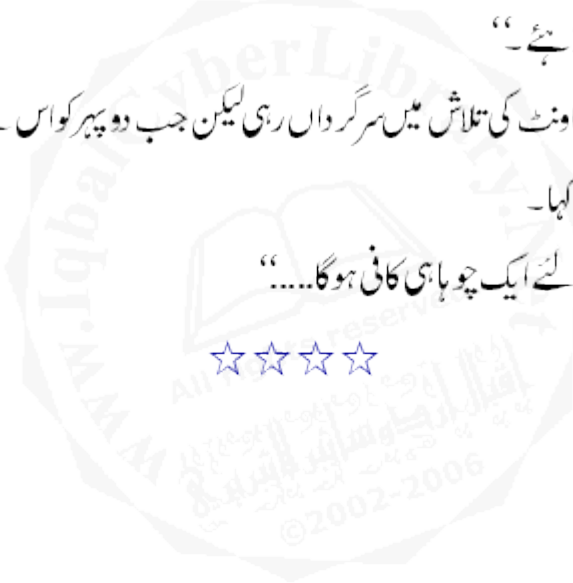
اسی طرح انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا۔

لومڑی

ایک لومڑی نے صبح وقت اپنے سائے پر نظر ڈالی اور کہا مجھے آج ناشتے کے لئے اونٹ ماننا چاہئے۔“

وہ تمام صبح اونٹ کی تلاش میں سرگرداں رہی لیکن جب دوپہر کو اس نے دوبارہ اپنا سایہ دیکھا تو کہا۔

”میرے لئے ایک چوہا ہی کافی ہوگا....“



دانشمند بادشاہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شہر ہر جس کا نام ویرانی تھا۔ ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ جو بڑا بہادر اور دانش مند تھا اس کی بہادری کی وجہ سے لوگ اس سے ڈرتے تھے اور اس کی دانش مندی کی وجہ سے اسے پیار کرتے تھے۔

اس شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور موتی کی طرح شفاف تھا۔ شہر کے تمام لوگ بلکہ خود بادشاہ اور اس کے درباری اسی کنوئیں میں سے پانی پیتے تھے۔ کیونکہ اس کے سوا شہر میں اور کوئی کنواں نہ تھا۔ ایک رات جب تمام لوگ محو خواب تھے ایک ساحرہ شہر میں داخل ہوئی اور ایک عجیب دوائی کے ساتھ قطرے کنوئیں میں ڈال دیئے اور کہا۔ ”اس کے بعد جو شخص یہ پانی پئے گا وہ دیوانہ ہو جائے گا۔“

دوسرے دن بادشاہ اور اس کے وزیروں کے سوا شہر کے تمام باشندوں نے کنوئیں کا پانی پیا اور ساحرہ کی پیش گوئی کے مطابق دیوانے ہو گئے۔

اس دن شہر کے تنگ گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کے کان میں یہی کہتے رہے کہ ہمارے بادشاہ اور وزیر اعظم کی عقل ماری گئی ہے اور ہم اس اپانج بادشاہ کی حکومت برداشت نہیں کر سکتے اور اسے تخت سے علیحدہ کر دیں گے۔

جب شام ہوئی تو بادشاہ سونے کے ایک برتن میں اس کنوئیں سے پانی منگوا لیا جب پانی آیا تو اس نے اسے خود بھی پیا اور اپنے وزیر اعظم کو بھی پلایا پھر کیا تھا۔ شہر ویرانی میں خوشی کے شادیاں بجنے شروع ہو گئے کیونکہ لوگوں نے دیکھا کہ ان کے بادشاہ اور وزیر اعظم کا دماغ درست ہو گیا ہے۔



بلند ارادے

تین آدمی ایک قہوہ خانے کی میز پر ملے ان میں سے ایک جلاہا دوسرا بڑھئی اور تیسرا ایک گورکن تھا۔

جلاہے نے کہا..... ”میں نے آج ایک نفیس لٹھے کا کفن دو اشرفیوں میں بیچا ہے۔
آؤ ہم سب دل کھول کر شراب پیئیں۔“

بڑھئی نے کہا۔ ”میں نے آج ایک بڑا اعلیٰ تابوت بیچا ہے اس لئے ہم شراب کے
سات شامی کباب بھی کھائیں گے۔“
گورکن نے کہا۔

”میں نے آج صرف ایک ہی قبر کھودی ہے لیکن مرحوم کے ورثاء نے مجھے دگنے
پیسے دیئے ہیں آؤ ہم تھوڑے رس گلے بھی منگوائیں۔“

رات قہوہ خانے میں دیر رونق رہی اور تینوں شخص شراب کباب اور مٹھائی اڑاتے
رہے۔ کیونکہ وہ تینوں مخمور و مسرور تھے۔

دوکان کا مالک خوش ہو ہو کر اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے گاہک
بے دریغ صرف کر رہے تھے۔

جب وہ قہوہ خانے سے نکلے تو چاند طلوع ہو چکا تھا۔

سڑک پر گاتے چلاتے اور زور زور سے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

کلاں اور کلاں قہوہ خانے کے دروازے پر کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

کلاں نے کہا۔ ”یہ لوگ کتنے آزاد اور خوش باش ہیں اگر یہ روز اسی طرح آئیں تو

ہمارے بیٹھے کو شراب کی دوکان پر سر کھپانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ اور ہم اپنی

آمدنی سے اسے اعلیٰ تعلیم دلا سکتے ہیں اور وہ ایک پادری بن سکتا ہے۔“



بڑا سمندر

میں اور میری روح بڑے سمندر پر نہانے کے لئے گئے۔ تو ہم ایک پوشیدہ اور تنہا مقام تلاش کرنے لگے لیکن جونہی ہم روانہ ہوئے۔ ہم نے ایک چٹان پر ایک آدمی کو بیٹھے دیکھا۔ جو اپنے تھیلے میں سے چنگلی چنگلی نمک نکال کر سمندر میں پھینک رہا تھا میری روح نے کہا۔

”یہ شخص قنوطی ہے۔ آؤ یہ جگہ چھوڑ دیں..... ہم یہاں نہیں نہا سکتے.....“

ہم آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ ہم ایک ٹاپو کے پاس پہنچے وہاں ہم نے ایک آدمی کو سفید چٹان پر کھڑے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک جزاؤ دہ تھا۔ جس میں سے وہ کھانڈ نکال کر سمندر میں پھینک رہا تھا۔

میری روح نے کہا۔ ”یہ ایک رہ جاتی ہے اس لئے یہ بھی ہمارے برہنہ جسم کو نہ دیکھے.....“

ہم اور آگے بڑھے تو ہم نے ساحل پر ایک آدمی کو دیکھا جو مری ہوئی مچھلیاں چن چن کر بڑی نرم دلی سے انہیں دوبارہ پانی میں پھینک رہا تھا۔

میری روح نے کہا ”ہم اس کے سامنے نہیں نہا سکتے کیونکہ یہ ایک مخیر ہے.....“

”ہم اور آگے بڑھے اور وہاں پہنچے جہاں ایک آدمی ریت پر اپنے سائے کا نقش اتار رہا تھا۔ سمندر کی بے پناہ لہریں آتیں اور اس نقش کو مٹا دیتیں لیکن وہ برابر نقش بنا نے میں مصروف تھا،

میری روح نے کہا۔ ”یہ شخص سو فی ہے آؤ اسے چھوڑ دیں۔“

ہم آگے بڑھے اور سمندر کے کنارے ایک آدمی کو دیکھا جو جھاگ کو اکٹھا کر کے ایک سیاہ برتن میں ڈال رہا تھا۔

میری روح نے کہا..... ”یہ ایک حقیقت پرست ہے اور اسے ہماری برہنگی کا نظارہ نہیں کرنا چاہئے۔“

ہم اور آگے بڑھے دفعتاً ہم نے ایک آواز سنی.....“ یہ سمندر ہے گہرا، وسیع اور پر شوکت اور جب ہم اس آواز کے قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی سمندر کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہے اور ایک سیپ کوکان سے لگائے اس کی آواز سن رہا ہے۔

میری روح نے کہا.....“چلو یہاں سے چلیں یہ ایک ظاہر پرست ہے جو کسی بات کی پوری حقیقت نہ سمجھنے پر اپنی توجہ اس کے کس جزو پر مرکوز کر دیتا ہے۔“

اس طرح ہم آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ ہم نے ایک آدمی کو ریت میں سر دبائے دیکھا۔ میں نے اپنی روح سے کہا.....“ہم یہاں نہا سکتے ہیں کیونکہ یہ شخص ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔“

میری روح نے کہا.....“نہیں یہ تو ان سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ ایک یوگی ہے.....“

تب میری روح کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی، اور اس نے غمناک آواز میں کہا۔“آؤ ہم یہاں سے چلیں، کیونکہ یہاں کوئی علیحدہ اور پوشیدہ جگہ نہیں ہے جہاں ہم نہا سکیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہوا میرے سنہری کاکلوں کے ساتھ کھیلے یا میں اپنا سینہ اس ہوا میں برہنہ کروں یا روشنی کو اجازت دوں کہ وہ میرے پوتر جو بن کو عریاں کرے۔“

تب ہم اس سمندر کو چھوڑ کر ایک بڑے سمندر کی تلاش میں نکلے۔“



مصلوب

میں نے لوگوں سے چلا کر کہا۔ ”میں سو لی پرچہ ہوں گا۔“
انہوں نے کہا..... ”ہم تمہارا خون اپنی گردن پر یوں لیں.....“
میں نے جواب دیا..... کہ تم دیوانوں کو مصلوب کئے بغیر کیسے ترقی کر سکتے
ہو.....؟“

انہوں نے میری بات مان لی اور مجھے مصلوب کر دیا..... اور مصلوبیت نے مجھے
مطمئن کر دیا۔

اور جب میں سو لی پر لٹک رہا تھا تو انہوں نے مجھے دیکھنے کے لئے اپنے سر اوپر
اٹھائے۔ اسی طرح وہ سر بلند ہو گئے کیونکہ اس سے پہلے ان کا سر کبھی اوپر نہ اٹھا تھا۔
لیکن جب وہ میری طرف سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ تو ایک نے پوچھا..... ”تم
کس چیز کا کنارہ ادا کر رہے ہو؟“

دوسرا چلایا..... ”تم نے کس مقصد کے لئے اپنی جان قربان کی.....؟“
تیسے نے کہا..... ”کیا تو خیال کرتا کہ تو اس قیمت پر حیات جاوداں حاصل کر لے
گا؟“

میں نے ان سب کو جواب دیتے ہوئے کہا۔
”تم صرف اتنا ہی یاد رکھو..... کہ میں مسکراتا تھا، میں نے کنارہ ادا نہیں کیا، قربانی
نہیں دی اور نہ میں شہرت چاہتا ہوں تم نے کوئی ایسا قصور نہیں کیا جسے میں معاف
کروں، میں پیسا تھا اور میں نے تم سے التجا کی کہ تم میرا خون مجھے پلا دو، کیونکہ ایک
دیوانے کی پیاس اس کے خون کے سوا اور کسی چیز سے نہیں بجھ سکتی میں گونگا تھا اور
وہاں زخم پیدا کرنے کے لئے گھاؤ چاہتا تھا میں تمہارے لیل و نہار میں مقید تھا۔ اور
میں نے بہتر دنوں اور راتوں کے لئے دروازہ تلاش کیا، اب میں جاتا ہوں جس
طرح دوسرے مصلوب جا چکے ہیں اور یہ نہ سمجھنا کہ ہم دار پرچہ ہونے سے اکتا چکے

ہیں کیونکہ ہم اس سے بڑی زمینوں اور بڑے آسمانوں کے درمیان اس سے زیادہ
ہجوم کے ساتھ بار بار رسولی چڑھائے جائیں گے۔“



نجومی

میں اور میرے دوست نے معبد کے زیر سایہ ایک اندھے آدمی کو بیٹھے دیکھا، اور میرے دوست نے کہا..... ”ہمارے ملک کے سب سے بڑے دانشمند کو دیکھو.....“

میں نے اپنے دوست کو وہیں چھوڑا، اور اندھے آدمی کی طرف بڑھ کر اسے سلام کیا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے کہا۔ ”اس سوال کے لئے مجھے معاف رکھیے گا لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اندھے کب سے ہوئے؟“

اس نے جواب دیا ’یوم ولادت سے‘

میں نے کہا..... ”اور آپ کون سے مذہب کے پیرو ہیں“

اس نے کہا۔ ”میں ایک کاہن ہوں“

پھر اس نے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ان تمام اجرام فلکی، سورج، چار اور ستاروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔“



بڑی تمنا

یہاں میں اپنے بھائی ”پیٹا اور اپنی بہن“ سمندر کی موج کے درمیان بیٹھا ہوں.....“

ہم تینوں تنہائی میں ایک جیسے ہیں اور جس محبت نے ہمیں آپس میں باندھ رکھا ہے، وہ گہری، مضبوط اور انوکھی ہے ہاں اس کی گہرائی میری بہن ی گہرائی سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کی قوت کے آگے میرے بھائی کی طاقت کوئی چیز نہیں اور وہ میری دیوانگی سے بھی زیادہ زالی ہے۔

صدیاں گزر چکی ہیں، جب کے پہلے دھند لکے نے ہمیں ایک دوسرے سے روشناس کیا اور اگرچہ ہم کتنی ہی دنیاؤں کی پیدائش جوانی رفنا کا منظر دیکھ چکے ہیں۔ پھر بھی ہم جو ان اور آرزو مند ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم تنہا ہیں..... کوئی ہمیں ملنے کے لئے نہیں آتا۔

اور اگرچہ ہم ایک مسلسل آغوش میں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ہمیں چین نہیں، بھلا دبی ہوئی خواہشوں اور بے چین کہا؟

وہ آگن دیو کہاں سے آئے گا جو میری بہن کے بستر کو گرما سکے۔ اور وہ کون سی لہر ہے جو میرے بھائی کے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرے گی؟

اور وہ کون سی حسینہ ہے جو میرے دل پر حکومت کرے گی؟

رات کے سناٹے میں میری بہن نیند کے عالم میں آگن دیو کی یاد میں بڑبڑاتی رہتی ہے، اور میرا بھائی اس دل کو ٹھنڈک پہنچانے والی دیوی کو پکارتا رہتا ہے۔ لیکن میں نیند کے عالم میں کسے بلاتا ہوں، مجھے معلوم نہیں۔

یہاں میں اپنے بھائی ”پیٹا“ اور بہن سمندر کی موج کے درمیان بیٹھا ہوں..... ہم تینوں تنہائی میں ایک جیسے ہیں اور جس محبت نے ہمیں آپس میں باندھ رکھا ہے، وہ گہری، مضبوط اور انوکھی ہے۔

گھاس کے ایک تنکے نے کہا

گھاس کے ایک تنکے نے خزاں رسیدہ پتے سے کہا۔ ”تم گرتے وقت شور کیوں مچاتے ہو؟ تمہارے اس شور نے میرے بہاریں خواب کو پریشان کر دیا ہے۔“

پتا غصے میں بھر کر بولا..... ”اونچ ذات کے پستی میں رہنے والے، موسیقی سے بے بہرہ، چڑچڑے تنکے، جب تو اونچی ہو امیں نہیں رہتا تو تو راگ کی لے کو کیا جانے؟“

پھر خزاں رسیدہ پتا زمین پر سو گیا، اور جب بہا آئی تو اس کی آنکھ کھلی۔ مگر اب وہ گھاس کا تنکا بن چکا تھا۔

جب پھر خزاں آئی اور اس پر دوسرے پتے گرنے لگے تو اس نے آہستہ سے کہا..... ”یہ خزاں رسیدہ ہتے کتنا شور مچاتے ہیں، اور میرے شیریں خواب کو پریشان کر دیتے ہیں.....“



چہرے

میں نے ایک ایسا چہرہ دیکھا ہے جس کے ہزاروں رخ ہیں اور ایک ایسا چہرہ بھی
دیکھا ہے جو صرف ایک قالب میں ڈھالا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے ایک ایسا چہرہ دیکھا ہے جس کی چمک دمک کی تہہ میں مجھے بدنمائی نظر آئی

اور ایسا چہرہ بھی جس کی روشنی حسن و جمال کو چھپا رہی تھی۔ مجھے ایک بوڑھا چہرہ بھی
نظر آیا جس پر بے معنی جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔

اور ایک صاف چہرہ بھی دیکھا جس پر تمام باتیں نقش تھیں۔ میں ان تمام چہروں
سے واقف ہوں کیونکہ میرا تازنگاہ اپنے بنے ہوئے پردوں کے پار چلا جاتا ہے اور
چھپی ہوئی حقیقت کو پالیتا ہے۔



دو عالم

ایک شہر میں دو عالم رہتے تھے جو آپس میں شدید اختلافات رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی قابلیت کا مستحکمہ اڑاتے تھے، ان میں سے ایک دہریہ تھا اور دوسرا خدا پرست۔ ایک دن دونوں بازار میں ملے اور اپنے اپنے معتقدوں کی موجودگی میں خدا کے وجود اور عدم وجود پر بحث کرنے لگے گھنٹوں مناظرہ کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

اسی شام دہریہ مسجد میں گیا اور اپنے سابقہ گناہوں کی معافی کے لئے خدا سے التجا کی۔

دوسرے عالم نے فوراً اپنی کتابیں جلا دیں۔ کیونکہ اب وہ ایک دہریہ بن چکا تھا۔

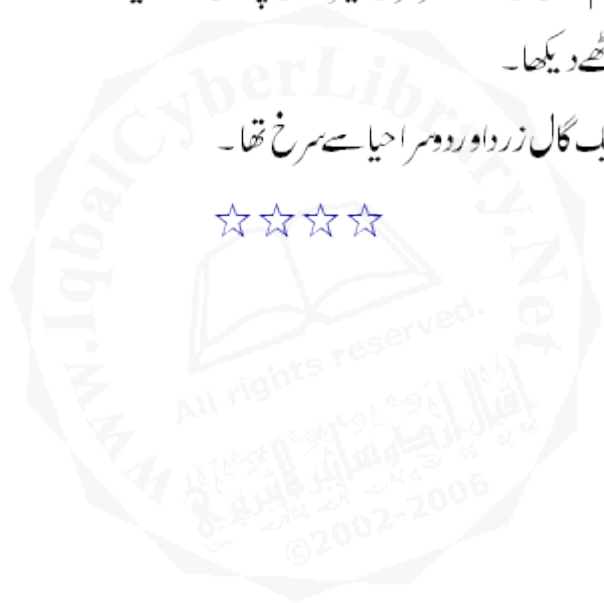


ہیکل کی سیڑھیوں پر

کل شام ہیکل کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر میں نے ایک عورت کو دو مردوں کے درمیان بیٹھے دیکھا۔

اس کا ایک گال زرد اور دوسرا حیا سے سرخ تھا۔

☆☆☆☆



متبرک شہر

میں اپنے جوانی کے زمانے میں سنا کرتا تھا۔ کہ ایک ایسا شہر ہے جس کے باشندے آسمانی صحیفوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔

میں نے کہا ”میں اس شہر کو ضرور تلاش کروں گا اور اس سے برکت حاصل کروں گا۔“

یہ شہر بہت دور تھا۔ میں نے اپنے سفر کے لئے خوب سامان جمع کیا۔ چالیس دن کے بعد میں نے اس شہر کو دیکھا اور اکتالیسویں دن اس کے اور داخل ہوا۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس شہر کے تمام باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ ہے۔ میں نے حیران ہو کر اپنے دل میں کہا۔ ”کہ اتنے متبرک شہر کے باشندوں کا صرف ایک ہاتھ اور ایک آنکھ!“

میں نے دیکھا کہ وہ خود بھی اس بات پر حیران ہیں، میرے دو ہاتھوں اور آنکھوں نے انہیں حیرت کر دیا۔ اس لئے جب وہ میرے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے تو میں نے ان سے پوچھا۔

”کیا یہ وہی متبرک شہر ہے جس کا ہر باشندہ و مقدس صحیفوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا۔

”ہاں یہ وہی شہر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری یہ حالت کیونکر ہوئی؟ تمہاری دہنی آنکھیں اور داہنے ہاتھ کیا ہوئے؟“

وہ سب میری بات سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے کہا۔

آ، اور دیکھ.....

وہ مجھے شہر کے ایک معبد میں لے گئے۔ جو اس کے وسط میں واقع تھا۔ میں نے

اس معبد کے صحن میں ہاتھوں اور آنکھوں کا ایک انبار لگا ہوا دیکھا۔ وہ سب گل سڑ رہے تھے پھر میں نے کہا۔

”فسوس کس سنگ دل فاتح نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟“

اس پر نہوں نے زیر لب گفتگو شروع کی اور ایک بوڑھیا دی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا.... ”یہ ہمارا اپنا کام ہے۔ خدا نے ہمیں اپنی برائیوں پر فتح دی ہے....“
یہ کہہ کر وہ مجھے ایک اونچے منبر پر لے گیا۔ باقی تمام لوگ ہمارے پیچھے تھے پھر اس نے منبر کے اوپر ایک تحریر دکھائی جس کے الفاظ یہ تھے۔

اگر تمہاری داہنی آنکھ تمہیں ٹھوکر کھلائے تو اسے باہر نکال پھینکو، کیونکہ سارے جسم کے دوزخ میں ہڑے سے ایک عضو کا ضائع ہونا بہتر ہے۔ اور اگت تمہارا دانا ہاتھ تمہیں برائی پر مجبور کرے تو اسے کاٹ کر پھینک دو تا کہ تمہارا صرف ایک عضو ضائع ہو جائے اور سارا جسم دوزخ میں نہ پڑے۔

یہ عبارت پڑھ کر مجھ کو ساری حقیقت معلوم ہو گئی میں نے منہ موڑ کر تمام لوگوں کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”کیا تم میں کوئی آدمی یا عورت نہیں جس کے دو ہاتھ اور دو آنکھیں ہوں۔“

ان سب نے جواب دیا ”نہیں کوئی نہیں، یہاں ان بچوں کے سوا جو کمسن ہونے کی وجہ سے اس کتبہ کو پڑھنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ کوئی شخص صحیح و سالم نہیں۔“

جب ہم معبد سے باہر آئے تو فوراً اس متبرک شہر سے بھاگ نکلا کیونکہ میں کمسن نہ تھا اور اس کتبے کو بخوبی پڑھ سکتا تھا۔



نیکی اور بدی کا فرشتہ

نیکی اور بدی کے فرشتے پہاڑ کی چوٹی پر ملے۔

نیکی کے فرشتے نے کہا ”یا اخی، صبح بخیر.....“

بدی کا فرشتہ خاموش رہا۔

نیکی کے فرشتے نے کہا۔ ”آج آپ کا مزاج کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔“

بدی کے فرشتے نے کہا۔ ”ایک عرصہ سے لوگ مجھے تمہاری جگہ سمجھ لیتے ہیں۔

تمہارے ہی نام سے پکارتے ہیں اور تمہاری طرح سلوک کرتے ہیں، یہ بات مجھے

سخت ناپسند ہے۔“

نیکی کے فرشتے نے کہا..... ”لیکن مجھے تمہاری جگہ سمجھ لیا جاتا ہے اور تمہارے ہی

نام سے پکارا جاتا ہے۔“

یہ سن کر بدی کا فرشتہ انسان کی حماقت پر نفرین کرتے ہوئے چلا گیا۔



شکست

شکست..... میری شکست..... میری تنہائی اور علیحدگی۔

تو مجھے ہزاروں فتوحات سے زیادہ عزیز ہے۔

ہاں تو مجھے دنیا کی تمام شکوتوں سے زیادہ عزیز ہے۔

شکست..... میری شکست..... میرے شعور ذات اور میری جرات مقابلہ۔

تو نے مجھے سمجھایا کہ میں ابھی نو جوان اور تیز گام ہوں اور کامیابی کے مرجھائے

ہوئے پھولوں کے فریب میں نہیں آ سکتا۔

میں نے تبھی سے تنہائی کا مزہ پایا ہے۔

اور لوگوں کے مجھ سے اجتناب کرنے اور نفرت کی نظر سے دیکھنے کی مسرت

حاصل کی ہے۔

شکست..... میری شکست..... میری چمکتی ہوئی تلوار اور ڈھال۔

میں نے تیری آنکھوں میں یہ پڑھا ہے۔

کہ تاج شاہی دراصل غلامی کا نشان ہے۔

دوسروں سے پچپانے جانا خاک میں مل جانے کے مترادف ہے۔

اور کسی کی سمجھ میں آ جانا پھلنے پھولنے کی آخری حد ہے۔

اور اس کے بعد کپکے ہوئے پھل کی طرح نیچے گر کر گھل مڑ جانا ہے۔

شکست..... میری شکست..... میری نہ مٹنے والی جرات۔

تو میرے گیت، میری فریادیں اور میری سکوت کی آواز سنے گی صرف تو میرے

ساتھ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ۔

سمندروں کی ہیجان

اور ان پہاڑوں کے شور کا ذکر کرے گی جو رات کو چو جلتے ہیں۔ صرف تو ہی میری

توح کی بلند اور عمود دار گھاٹی پر چڑھے گی شکست..... میری شکست..... میری نہ مٹنے

والی حرات۔

ہم دونوں طوفان کے ساتھ تہمتے لگائیں گے۔

اور ہم اپنے دل میں مرنے والے جذبات کے لئے قبریں کھودیں گے۔

ہم دھوپ میں پکے ارادے کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔

اور ہمارا وجود دنیا کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔



All rights reserved.

©2002-2006

دوسا دھو

ایک پہاڑ پر دوسا دھو رہتے تھے۔ ان کا کام خدا کی عبادت اور آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کے پاس مٹی کا ایک پیالہ تھا..... اور یہی ان دونوں کی کائنات تھی۔

ایک دن بڑے سادھو کے دل میں بدی کی روح داخل ہوئی وہ چھوٹے سادھو کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ ”ہم دونوں کو اکٹھے رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے اور اب جدا ہونے کا وقت آپہنچا ہے اس لئے آؤ ہم اپنی جائیداد تقسیم کر لیں۔ چھوٹے سادھو نے مغموم ہو کر کہا۔

”بھائی تمہاری جدائی کا خیال میرے دل پر شاق گزر رہا ہے لیکن اگر تم جانا ہی چاہتے ہو، تو خیر یونہی ہی.....“

یہ کہہ کر اس نے وہ پیالہ بڑے داسھو کے سامنے لا کر رکھ دیا، اور کہا۔ ”ہم اسے آپس میں بانٹ نہیں سکتے اس لئے یہ پیالہ آپ ہی لے لیں.....“

بڑے سادھو نے کہا، نہیں میں خیرات نہیں مانگنا چاہتا۔ میں اپنے حصے کے سوا اور کچھ نہ لوں گا..... ہمیں یہ پیالہ آپس میں تقسیم کرنا پڑے گا۔“

چھوٹے سادھو نے کہا..... اگر یہ پیالہ ٹوٹ گیا، تو یہ ہمارے کس کام آئے گا؟ اگر تم پسند کرو تو آؤ ہم قرعہ ڈال کر اس کا فیصلہ کر لیں.....“

لیکن بڑے سادھو نے دوبارہ کہا۔ ”میں صرف وہی چیز لوں گا جسے انصاف میری ملکیت قرار دے اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ انصاف کو قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔ ہمیں یہ پیالہ ضرور تقسیم کرنا پڑے گا.....“

اس پر چھوٹے سادھو سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور اس نے کہا..... ”اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو لاؤ اسے توڑ ڈالیں۔“

یہ سن کر بڑے سادھو کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ اور وہ چلا کر بولا۔

”اور بزدل انسان، کیا تو اس پیالے کے لئے میرے ساتھ لڑے گا بھی نہیں.....“

رات اور پاگل

پاگل: ”میں تیرے جیسا ہوں، اور رات! تاریک اور برہنہ اور میں ایک ایسے آتشیں راستے پر چلتا ہوں جو میرے دن کے خوابوں سے بلند ہے اور جب میرا پاؤں زمین کو چھوتا ہے یواس ایک فلک بوس شاہ بلوط کا درخت اگ پڑتا ہے۔

رات: ”نہیں دیوانے! تو میرے جیسا نہیں ہے۔ کیونکہ تو اب بھی پیچھے موڑ کر دیکھتا ہے کہ تو نے ریت پر اپنے پاؤں کے کتنے بڑے نشان چھوڑے ہیں۔“

پاگل: ”اے رات میں تیری طرح خاموش اور عین ہوں اور میرے تہائیوں کے دل میں ایک دیوی زچگی کے عالم میں بیٹھی ہے اور جو بچہ اس کے بچن سے پیدا ہوگا۔ اس میں بہشت اور دوزخ یکجا ہوں گے۔“

رات: ”نہیں اودیوانے تو میرے جیسا نہیں، کیونکہ تو درد کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہے، اور دوزخ کا گیت تجھے ڈرا دیتا ہے۔“

پاگل: اور رات! میں تیری طرح وحشی اور خوفناک ہوں، کیونکہ میرے کانوں میں شکست اور خوردہ قوموں کی چیخیں اور بھولے ہوئے ملکوں کی یاد میں ابھرنے والی آئیں گونج رہی ہیں۔

رات: ”نہیں دیوانے تو میرے جیسا نہیں ہے، کیونکہ تو اپنے چھوٹے من کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے لیکن اپنے بڑے من سے دوستی نہیں رکھتا۔

پاگل: اور رات میں تیری جابر اور قاہر ہوں، کیونکہ میرا سینہ سمندر پر چلنے والے جہازوں سے روشن ہے اور میرے ہونٹ مقتول بہادروں کے خون سے تر ہیں۔“

رات: ”نہیں اودیوانے تو مجھ ایسا نہیں ہے کیونکہ تیرے دل میں ابھی

ایک ہم نفس کی تمنا بے تاب ہے اور تو اپنے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہیں کر سکتا۔“

پاگل: ”اے رات میں تیری طرح مسرور اور شاد ماں ہوں، کیونکہ جو شخص میرے سائے میں آباد ہے وہ ایک اچھوتی شراب سے بدمست ہے اور وہ عورت جو

میرا تعاقب کرتی ہے خوشی سے گناہ کرتی ہے۔“

رات: ”نہیں اودیوانے تو مجھ ایسا نہیں ہے کیونکہ تیری روح سات پر

دو میں ملفوف ہے اور تیرا دل تیرے قابو نہیں.....“

پاگل: ”اے رات میں تیری طرح صابر اور پر جوش ہوں، کیونکہ میرے سینے میں

ہزاروں عاشق مر جھائے ہوئے بوسوں کا کفن پہنے ہوئے مدفون ہیں.....“

رات: اودیوانے کیا تو مجھ ایسا ہے؟ کیا تو طوفان کو گھوڑا بنا کر سواری کر

سکتا ہے اور بجلی کو تلوار کی مانند ہاتھ میں لے سکتا ہے؟

پاگل: ”ہاں اے رات میری تیری طرح پر شکوہ اور سر بلند ہوں میرا تخت گرے

ہوئے دیوتاؤں کے ڈھیر پر بنا ہے اور دن میرا دامن چومنے کے لئے میرے سامنے

سے گزرتے ہیں لیکن میرے چہرے کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔“

رات: ”میرے تاریک دل کے فرزند کیا تو مجھ ایسا ہے؟ کیا تو میرے

بے قابو خیالات کو اپنے اختیار میں لاسکتا ہے اور میری وسیع زبان بول سکتا

ہے.....؟“

پاگل: ”ہاں اے رات ہم تو ام ہیں، کیونکہ تو آشکار کرتی ہے اور میں اپنا دل کھول

کر رکھ دیتا ہوں.....“

☆☆☆☆-----اختتام-----☆☆☆☆